مرزا عظیم بیگ چغتائی

ڈاکٹر ہارون ایوب

مرزا عظیم بیگ چغتائی

ڈاکٹر ہارون ایوب

صدر۔ شعبۂ اُردو۔ پنجاب یونیورسٹی۔ چنڈی گڑھ

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

Mirza Azeem Beg Chughtai

By

Dr. Haroon Ayub

سنہ اشاعت جولائی، ستمبر 1990 شک 1912
© ترقی اردو بیورو، نئی دہلی
پہلا اڈیشن : 1000
قیمت : -/12
سلسلۂ مطبوعات 634

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی-110066
طابع : سُپر پرنٹرز ۔ دہلی ۔ ۵۱

پیش لفظ

ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے ترقی اردو بیورو (بورڈ) قائم کیا گیا۔ اردو کے لیے کام کرنے والا یہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو دو دہائیوں سے مسلسل مختلف جہات میں اپنے خاص خاص منصوبوں کے ذریعہ سرگرم عمل ہے۔ اس ادارہ سے مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں خاصی تعداد میں سماجی ترقی، معاشی حصول، عصری تعلیمی اور معاشرہ کی دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شائع کی گئی ہیں جن میں اردو کے کئی ادبی شاہکار، بنیادی متن، قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی وضاحتی فہرستیں تکنیکی اور سائنسی علوم کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصہ میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترقی اردو بیورو نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اہمیت دی ہے۔ کیونکہ کتابیں علم کا سرچشمہ رہی ہیں اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقاء کی تاریخ مکمل نہیں تصور کی جاتی۔ جدید معاشرے میں کتابوں کی اہمیت مُسلّم ہے۔ بیورو کے اشاعتی منصوبہ میں اردو انسائیکلوپیڈیا، ذولسانی اور اردو۔ اردو لغات بھی شامل ہیں۔

ہمارے قارئین کا خیال ہے کہ بیورو کی کتابوں کا معیار اعلا پائے کا ہوتا ہے اور وہ ان کی ضرورتوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کررہی ہیں۔ قارئین کی سہولتوں کا مزید خیال کرتے ہوئے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچے اور وہ اس بیش بہا علمی خزانہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہوسکیں۔

یہ کتاب بھی بیورو کے اشاعتی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے علمی ادبی ذوق کے تسکین کا باعث بنے گی اور آپ کی ضرورت کو پورا کرے گی۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو

ترتیب

1 مرزا عظیم بیگ چغتائی کے حالاتِ زندگی 9

2 مرزا عظیم بیگ چغتائی کے عادات و اطوار 13

3 مرزا عظیم بیگ چغتائی کی ادبی زندگی کا آغاز 23

4 مرزا عظیم بیگ چغتائی کی زود نویسی 29

5 مرزا عظیم بیگ چغتائی کی چند اہم تصانیف کا تعارف 37

خانم۔ چمکی۔ شریر بیوی۔ ملفوظاتِ حاجی 39-63

خطوط کی ستم ظریفی۔ چینی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز

مضامین چغتائی۔ مرزا جنگی۔ سوانگ کی ردجیں

کمزوری اور ویمپائر

6 مرزا عظیم بیگ چغتائی کی تصانیف کی فہرست 65

7 مرزا عظیم چغتائی کے خیالات، افسانہ نویسی کے بارے میں 67

8 مرزا عظیم بیگ چغتائی کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ 71

9 مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بارے میں اساتذہ اور ناقدین کی آرار 89

10 مرزا عظیم بیگ چغتائی کا بہترین افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" 99

مرزا عظیم بیگ چغتائی کے حالاتِ زندگی

اُردو کے مشہور و معروف مزاح نگار مرحوم مرزا عظیم بیگ چغتائی کا آبائی وطن آگرہ ہے۔ اُن کے والد بزرگوار جناب قسیم بیگ چغتائی اترپردیش اضلاع میں کلکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود تھا۔ آگرہ شہر میں جدّی جائیداد بھی تھی۔

اُردو کے ابتدائی دور کے ناول نگاروں میں منشی امداد علی کا نام بہت نمایاں ہے جو ان کے نانا تھے، ان کے دو ناول خاص طور پر "رزم بزم" اور "البرٹ بل" اپنے وقت میں بہت مقبول ہو چکے ہیں ——— آج کے دور کی مقبول ترین افسانہ نویس اور ناول نگار محترمہ عصمت چغتائی یہ عظیم بیگ چغتائی کی چھوٹی بہن ہیں۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی 1895ء میں جودھپور میں پیدا ہوئے۔ وہ پیدائش سے ہی بہت کمزور تھے، اس لیے دوسرے بچّوں کے مقابلے میں اُن کی طرف والدین کی خاص توجّہ رہی اور بہت لاڈ پیار سے

پرورش ہوئی ——— عصمت چغتائی صاحبہ اپنے ایک مضمون "دوزخی" میں لکھتی ہیں :

"شروع سے ہی رُوتے دھوتے پیدا ہوئے، روئی کے گالوں میں رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا۔ قوی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں والد صاحب کمزور جان کر معاف کر دیتے، ہر ایک دِل جُوئی میں لگا رہتا۔[1]

مرزا عظیم بیگ چُغتائی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، کچھ اٹاوہ کے اسکول میں حاصل کی۔ والد کی پنشن کے بعد سب لوگ آگرہ کے موروثی مکان میں رہنے لگے لیکن جلد ہی پھر سب علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے اور ایل ایل۔بی کے امتحانات پاس کیے۔

ابھی وہ تعلیم حاصل کر ہی رہے تھے کہ اُن کی شادی رامپور کے ایک پٹھان خاندان میں ہو گئی ——— گھر کے اخراجات میں اضافہ ہو گیا، اس لیے انھوں نے نواب مزمل اللہ خاں صاحب کے یہاں ایک چھوٹی سی ملازمت کر لی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور

---

[1] چوٹیں۔ 148

باقاعدہ افسانے لکھنا شروع کیے —— اُن کا پہلا افسانہ "ہنگوٹی کی مصیبت" نیرنگ خیال کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس افسانہ کے چھپتے ہی ادبی حلقوں میں ایک بھونچال سا آگیا۔ ہر ایک کی زبان پر صرف اُن کا ہی نام تھا۔ حالانکہ بچّوں کی کہانی " قصر صحرا" کا پہلا حصّہ وہ میٹرک کا امتحان پاس کرنے سے پہلے ہی لکھ چکے تھے۔ شاید اسی لیے ان کے والد مرحوم ان کے ہر افسانے کو " قصر صحرا" کے ہی نام سے یاد کرتے تھے۔ محترمہ عصمت چغتائی فرماتی ہیں :

"عظیم بھائی کہتے سرکار دنیا میں جھوٹ بغیر کوئی رنگینی نہیں۔
بات کو دلچسپ بنانا ہو تو جھوٹ اس میں ملا دو۔" ؎۱

تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے جودھپور میں وکالت شروع کی اور ایک لمبے عرصہ تک وکالت اور افسانے لکھنے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ مگر کام کی زیادتی، فکروں کا بوجھ کمزور اور ناتواں جسم زیادہ دنوں تک برداشت نہ کرسکے اور بخار کے ساتھ ساتھ کھانسی رہنے لگی۔

اُن ہی دنوں نواب جاورہ نے انھیں بلا کر اپنی ریاست کا چیف جج بنا دیا۔ وہ نہ جانے کب سے اُن کی قدردانی پر مائل تھے —— یہ دو تین سال کا عرصہ کچھ آرام سے گزرا۔ عالی شان کوٹھی رہنے کو ملی۔ ہر طرح

؎۱ چوٹیں۔ صفحہ 153

کا عیش و آرام نصیب ہوا لیکن جاورہ کی مرطوب آب و ہوا میں چغتائی صاحب کو سانس کی شکایت اور زیادہ رہنے لگی، جس کی وجہ سے صحت گرتی ہی چلی گئی ــــ ڈاکٹروں کے مشورے سے وہ پھر جودھپور آگئے اور وہاں سے استعفیٰ بھیج دیا۔

ایک بار پھر وکالت کا سلسلہ شروع کیا لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے زیادہ توجہ نہ دے سکے، جس کے نتیجہ میں وکالت جم نہ سکی تو پھر انھوں نے اپنی ہی کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا۔

لیکن بیماری دن بہ دن طول پکڑتی چلی گئی اور ہر وقت بخار رہنے لگا۔ کھانسی کے مارے سینے میں سانس نہیں سماتا تھا۔ مگر آخر وقت تک دماغ اسی طرح سے روشن رہا۔

آخر وقت میں اُردو کے عظیم مزاح نگار جناب عظیم بیگ چغتائی کی حالت قابلِ رحم تھی۔ کوئی اُن کے پاس نہیں تھا، صرف والدہ صاحبہ اُن کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ بیگم صاحبہ کو زبردستی میکے بھیج دیا گیا تھا کیونکہ وہ ان کی تیمارداری کرتے کرتے خود دق کے مہلک مرض میں مبتلا ہوگئی تھیں ــــ آخر کار تپ دق کے مہلک مرض نے مرزا عظیم بیگ چغتائی کی تمام صلاحیتوں پر پانی پھیر دیا۔ اور دُنیا کو ہنسانے والا 1941ء میں اس جہان فانی سے رخصت ہوگیا۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی

کے

عادات واطوار

مرزا عظیم بیگ چغتائی بہت ہی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کے گفتگو کرنے کا انداز بہت ہی دلچسپ تھا، جو انھیں ورثہ میں ملا تھا۔ بقول عصمت چغتائی:۔

"کنبہ کا کنبہ حد درجہ بامذاق اور باتونی تھا۔ آپس میں چخیں چلتیں، نئے نئے جملے تراشے جاتے، ایک دوسرے کی دھجیاں اڑائی جاتیں۔ بچے بچے کی زبان پر سان رکھ جاتی۔" ؎[1]

مرزا عظیم بیگ چغتائی ناتواں اور کمزور ضرور تھے مگر دوسروں کی دھجیاں اڑانے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ آپ محنتی اور ذہین تھے جسمانی کمزوری کی تلافی دماغی قوت سے کرتے تھے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے تاریخ اسلام

---

[1] فن و شخصیت۔ آپ بیتی نمبر۔ صفحہ 179

کا مطالعہ کر ڈالا، کیونکہ اُن دنوں علی گڑھ کے آزاد خیال، مغربی تہذیب کے دلدادہ حضرات العد قدامت پرستوں، مذہبی خیالات رکھنے والوں کے درمیان اکثر مباحثے ہوا کرتے تھے۔ اِن مباحثوں میں عظیم بیگ چغتائی صاحب کو بہت لُطف آتا تھا اور وہ خوب بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ مثالوں میں حدیثیں پیش کرتے تھے۔ متعدد مستند کتابوں کے حوالے پیش کرتے تھے اور لوگوں کو قائل کرتے تھے۔ اُنھوں نے قرآن کی بہت سی آیات یاد کر لی تھیں۔ اُن سے بے تکان حوالے دیتے، اگر کوئی شک کرتا تو فوراً قرآن نکال کر دکھا دیتے۔ قرآن شریف ہمیشہ اُن کے مطالعہ میں رہتا۔ اکثر کتابوں میں رکھا رہتا۔ وہ زیادہ تر لیٹ کر پڑھا کرتے تھے۔ قرآن شریف بھی وہ لیٹ کر ہی پڑھا کرتے تھے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی یہ بحثیں اس حد تک بڑھیں کہ نوبت شرط تک پہنچ گئی، یعنی شرط لگا کر بحث کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جناب شاہد احمد دہلوی نے اس سلسلے کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

ہم کسی مولانا قسم کے آدمی سے داڑھی منڈانے، نہ رکھنے پر بحث ٹھنی۔ تو شرط لگائی کہ اگر تم جیت گئے تو ہم داڑھی رکھ لیں گے اور اگر ہم جیت گئے تو تمہاری داڑھی مونڈ لیں گے ــــــ بہت سے تو شرط کی نوعیت سے گھبرا کر بھاگ جاتے اور کوئی ہمت کر کے

جم گیا تو سمجھ لو، اس کی شامت آگئی ـــــ سب لڑکوں کو نیوتا دے دیا جاتا۔ شام کو ایک جم غفیر کی موجودگی ۔۔۔۔ میں بحث شروع ہوتی۔ دلیلوں کی تصدیق یا تردید کی جاتی ـــــ آخر میں نہ جانے کیا ہوتا کہ چغتائی صاحب ہی ہمیشہ جیت جاتے۔ پھر کسی منچلے کے ہاں سے شیو کا سامان منگایا جاتا اور نہایت احتیاط سے داڑھی مونڈ کر محفوظ کر لی جاتی ـــــ اس طرح انھوں کئی داڑھیاں جیتی تھیں ـــ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جیتی ہوئی داڑھی بیچ دی جاتی تھی ـــــ وہ اس طرح کہ ہارے ہوئے مولانا سے اس کی کوئی مناسب قیمت لے لی جاتی اور اُن کو داڑھی بخش دی جاتی ـــــ اس قصاص سے یار لوگ مٹھائی منگاتے اور شیرینی تقسیم کی جاتی ـــــ ایسے ہی ایک مباحثے میں چغتائی صاحب ایک دفعہ ہار گئے۔ انھیں داڑھی رکھنا پڑی۔ اس وقت کی ایک تصویر بھی تھی۔ جسے میں نے "کامران" کے سرورق پر چھاپا تھا۔ خدا جانے پھر کیا کفّارہ ادا کیا کہ اس سے نجات پالی۔" [1]

مرزا عظیم بیگ چغتائی کے گفتگو کرنے کا انداز بھی بہت دلچسپ تھا بعض اوقات تو دو سو دلیلوں کو پال، پھوں سے آگے بڑھنے کی زحمت ہی نہیں

---

[1] نقوش شخصیات نمبر۔ صفحہ 122

دیتے تھے، بات میں سے بات کچھ اس دلچسپ پیرائے سے نکالتے اور واقعہ پر واقعہ اس طرح بیان کرتے کہ لوگ گھنٹوں اُن کی باتیں سُنتے اور جی نہیں بھرتا ـــــ شاہد احمد دہلوی صاحب اُن کے دلچسپ اندازِ گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"شام کو مرزا صاحب حسب وعدہ معہ بیگم صاحبہ آ گئے۔ رات کو سب احباب جمع ہوئے اور خوب قہقہے پہچہے رہے۔ رات گئے احباب رخصت ہوئے تو ہم سب سونے کے لیے لیٹے ـــــ مرزا صاحب، میں اور میرے منجھلے بھائی ـــــ مرزا صاحب بولتے رہے۔ میں سُنتا رہا، وہ بولتے رہے میں سو گیا۔ صبح اذان کے وقت آپ ہی آپ پھر بولنا شروع کر دیا ـــــ دیکھا کہ ہوں، ہاں بھی غائب ہے تو میرا شانہ ہلا کر بولے "ارے بھئی توبۃ النصوح کا پوتا آخر کب تک خواب دیکھتا رہے گا ـــــ ناچار جاگ کر ان کی باتیں سننے لگا۔ ـــــ ناشتے کے بعد کوئی ان سے ملنے آ گیا۔ میں ٹل گیا، کوئی گھنٹہ بھر کے بعد آیا تو منجھلے بھائی سے باتیں کر رہے تھے۔ ـــــ وہ پولیس کے آدمی تھے، ادب کے جھمیلوں سے اللہ نے انھیں محفوظ رکھا تھا۔ بولے۔ لو میاں سنبھالو انھیں۔

خوب آدمی ہیں۔ تمھارے چغتائی صاحب بھی ـــــ میاں
غضب خدا کا ساری رات باتیں کرتے رہے۔'' [1]

عصمت چغتائی صاحبہ بھی اپنے بڑے بھائی کے باتونی ہونے کا ذکر اپنے مضمون ''دوزخی'' میں کچھ اس انداز سے کرتی ہیں :

''باتوں کے اِس قدر شوقین تھے کہ دنیا کا کوئی انسان ہو، اس سے دوستی، کھریا بہادر میں جو لنگراں کے حالات ہیں وہ ایک میراسن سے معلوم ہوئے، اس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں بکواس ہو رہی ہے۔ لوگ متحیر ہیں کہ یا اللہ یہ بڑھیا میراسن سے کیا باتیں ہو رہی ہیں ـــ مگر جو کچھ انھوں نے لکھا وہ اس میراسن نے بتایا ہے۔ [2]

مرزا عظیم بیگ چغتائی بچپن سے ہی جسمانی طور پر کمزور تھے، اس لیے خاندان کے ہر فرد نے ان کا خیال رکھا۔ ہر ایک نے انھیں کمزور سمجھ کر معاف کر دیا، جس کی وجہ سے اُن میں احساس کمتری پیدا ہو گیا ـــــ وہ چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ عام انسانوں جیسا برتاؤ کیا جائے اور جب کوئی اس کے بدلے میں اُن سے ہمدردی کرتا تو انھیں غصّہ آتا اور

[1] نقوش شخصیات نمبر۔ 123

[2] چوٹیں۔ صفحہ 152

بغاوت کے جذبہ میں اضافہ ہو جاتا ـــــ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فسادی بن گئے ـــــ زبان اور دماغ خوب چلتا تھا ـــــ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا ـــــ چٹخارے والی زبان ایسی ترکیبیں چلتیں کہ جھگڑا ہو ہی جاتا ہے۔ بقول عصمت چغتائی :۔

"بہن بھائی۔ ماں باپ سب کو نفرت ہو گئی۔ اچھا خاصہ گھر میدان جنگ بن گیا۔ سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود۔ بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہو گئے۔ کمزور لاچار ہر دم کا ردگی، تھیٹر کا ولین، ہیرو بن گیا اور کیا چاہیے۔ ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں۔ زبان بد سے بدتر ہو گئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا۔ ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنا لینا بائیں ہاتھ کا کام ہو گیا"۔ [1]

خود پرستی کے سلسلے کا ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے جو اُن کی شادی کے چند دن کے بعد پیش آیا تھا ـــــ جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں کہ شادی رامپور کے ایک پٹھان خاندان میں ہوئی تھی ـــــ شادی کے بعد انھوں نے بیوی کا برقعہ اُتروا دیا اور کچھ عرصے کے بعد جب رامپور جانے کا اتفاق ہوا تو بیگم صاحبہ کو بے پردہ لے گئے۔ سسرال والے چغتائی صاحب کی اس

---

[1] چوٹیں۔ صفحہ 149

بات پر بہت ناراض ہوئے اور نوبت تناتنی تک پہنچ گئی ـــــ جس کے نتیجہ میں مشترکہ طور پر سسرال والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ لڑکی کو گھر بٹھا لیا جائے ـــــ چنانچہ چغتائی صاحب سے کہہ دیا گیا کہ ٹھنڈے ٹھنڈے چلتے پھرتے نظر آئیے ـــــ عظیم بیگ چغتائی صاحب نے بہت دھیرے سے کہا ـــــ "بیوی سے اور پوچھ لیجیے۔ اگر وہ رہنا چاہتی ہیں تو خوشی سے رہیں، میں چلا جاؤں گا اور اگر وہ میرے ساتھ چلنا چاہیں تو، آپ تو آپ دنیا کی کوئی طاقت انھیں نہیں روک سکتی ـــــ بات بہت معقول تھی ـــــ بیگم صاحبہ سے دریافت کیا گیا تو وہ نیک بخت چادر اوڑھ کر کھڑی ہو گئیں ـــــ گھر والوں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی، یہاں تک کہا کہ بی بی آپ ہماری بات نیچی کر کے جا رہی ہیں پھر اس دہلیز پر نہ آنا ـــــ وہ بیچاری روتی دھوتی چغتائی صاحب کے ساتھ ہو لیں اور پھر مدتوں میکے نہ گئیں۔

اس کے بالکل برخلاف وہ اپنے پیشے میں اتنے سخت نہیں تھے۔ موکلوں کی ہر بات کو نہایت دھیان سے سنتے اور ان کی ہر بات کا خیال رکھتے۔ یہاں تک کہ ان کی جائز اور ناجائز باتوں تک کو مان لیتے۔ ایک بار جناب شاہد احمد دہلوی صاحب جودھپور تشریف لے گئے۔ اور جناب چغتائی کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب چغتائی صاحب

وکالت کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں ایک دن شاہد صاحب نے پوچھ لیا:

"آپ کی وکالت یہاں کچھ چل بھی رہی ہے۔

کہنے لگے — کیوں نہیں — ہمارا رجسٹر دیکھو — یہ کہہ کر رجسٹر نکال کر دکھانے لگے۔

کسی سے پیشگی پانچ، کسی سے دس وصول ہوئے تھے۔ اور پچاس پچاس۔ ساٹھ ساٹھ باقی میں رکھے ہوئے تھے۔ بہت چمک کر بولے۔ پچھلے ماہ چالیس روپئے کی آمدنی ہوئی — چھ سو بقایا ہیں۔

میں نے کہا — ماشاء اللہ — خوب چل رہی ہے۔

بولے میاں — تم یافت کو دیکھتے ہو بقایا تو دیکھو — ہزاروں پر نوبت ہے۔ ہزاروں پر — [1]

لیکن چغتائی صاحب بعض معاملات میں بہت ضدّی واقع ہوئے تھے۔ کسی بھی قیمت پر دوسروں کی بات ماننے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ مثلاً اپنی ہی بیماری کے سلسلے میں انھوں نے ڈاکٹروں کی بات نہیں مانی اور نہ ہی گھر والوں کی — ڈاکٹروں نے تپ دِق تجویز کی — مگر وہ ہمیشہ کہتے

---

[1] نقوش۔ شخصیات نمبر۔ صفحہ ۔ 124

رہے کہ مجھے دمہ ہے۔ دق نہیں۔ اور اپنی مرضی سے نہ جانے کیا کیا دوائیں کھاتے رہے۔

مذہب کے سلسلے میں بھی عظیم بیگ چغتائی کے خیالات خاصے نرالے تھے۔ نماز کبھی نہیں پڑھتے تھے مگر قرآن شریف اکثر پڑھتے تھے، وہ بھی لیٹ کر ۔۔۔ یزید کے بہت بڑے مداح تھے۔ ان کی اس قسم کی باتیں سن کر خاندان کے بزرگ اکثر کہا کرتے تھے دوزخ میں جاؤ گے ۔۔۔ تو ان کا جواب کیا ہوتا یہ عصمت چغتائی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

> "تو فرماتے! یہاں کونسی اللہ میاں نے جنت دے دی ہے جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں۔ کچھ پرواہ نہیں۔ ہم تو عادی ہیں۔ اللہ میاں ہمیں دوزخ میں جلائیں گے تو ان کی لکڑی اور کوئلہ بے کار جائے گا۔ کیونکہ ہم تو ہر عذاب کے عادی ہیں۔ کبھی کہتے تھے اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم مر جائیں گے، جنت میں تو سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لیں گے۔" ؎[1]

دراصل مزاج میں سارا چڑچڑا پن جسمانی کمزوری کی وجہ سے تھا۔ جسم تو شروع ہی سے کمزور تھا لیکن دماغ بلا کا روشن۔ بہت ذہین تھے۔ فوراً بات کو سمجھ لیتے تھے اور اسی کے مطابق باتوں کا رُخ بدل دیتے تھے۔

؎[1] چوٹیں۔ صفحہ 155

توانا جسم والے جو کچھ کر دکھاتے تھے، وہ یہ خود نہیں کر پاتے تھے اس لیے ایک احساس کمتری جاگ اٹھا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے وہ خوب مطالعہ کرتے اور جب انھیں اپنی معلومات سے شکست دے لیتے، تب چین آتا ـــــ ضرورت سے زیادہ مطالعہ کی وجہ سے، جب بھی کسی سے بحث کرتے تو ہمیشہ ٹھوس دلائل کے ساتھ۔ بات بات میں کتابوں کے ساتھ ساتھ قرآن اور حدیثوں کے حوالے بے تکان دیتے ـــــ مگر آخر عمر میں انھوں نے بحثیں کرنا بھی بہت کم کر دیا تھا۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی
کی
ادبی زندگی
کا
آغاز

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بحیثیت افسانہ نگار کے کیا۔ اُن کا پہلا افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" رسالہ "نیرنگ خیال" کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس افسانہ کا شائع ہونا تھا کہ پوری ادبی دنیا میں ایک بھونچال سا آگیا۔ ہرایک کی زبان پر صرف ان کا نام تھا۔ ہر محفل میں ذکر تھا تو ان کے افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت کا ——— دراصل اس افسانے سے لوگوں نے انھیں پہچانا ——— یوں تو وہ بچپن سے ہی لکھ رہے تھے۔ انھوں نے پہلی کہانی "قصر صحرا" اس وقت لکھی جب وہ ۹ ویں کلاس کے طالب علم تھے ——— حالانکہ ادبی لحاظ سے یہ کچھ زیادہ اہم کام نہیں تھا لیکن پھر بھی عوام نے پسند کیا، تو دوسرا حصّہ انھوں نے انٹرپاس

کرنے کے بعد لکھا اور تیسرا حصہ اس وقت لکھا جب وہ بی اے کے طالب علم تھے ـــــ حالانکہ یہ کہانیاں کسی بھی طرح سے ادبی حیثیت کی حامل نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی ان کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

چغتائی صاحب جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے تو ان ہی دنوں انھوں نے پردے کے خلاف ایک کتاب لکھی، جس کا عنوان تھا۔ "قرآن اور پردہ" ـــــ جلد ہی اُن کی دوسری کتاب منظر عام پر آئی "حدیث اور پردہ" ـــــ یہ دونوں کتابیں بہت دن تک بحث کا موضوع بنی رہیں ـــــ آخر کچھ تو لوگوں کے سمجھانے اور کچھ بحث کے تلخ تجربات کی بنا پر آپ نے مذہب کی طرف سے توجہ ہٹائی اور ادبی مضامین اور افسانے لکھنا شروع کر دیے ـــــ پہلا افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" کی شانِ نزول کے بارے میں فرماتے ہیں:

"میں نے کبھی افسانے پڑھے تھے نہ لکھے، نہ شوق تھا۔ مگر ایک صاحب افسانہ پڑھنے لگے۔ میں نے منع کیا کہ کیا فضولیات پڑھا کرتے ہو۔ واہیات ہے۔ انھوں نے زبردستی سنایا اور تعریف کی ـــ میں نے کہا۔ لاحول ولا قوۃ۔ ہم ایسے خود دس افسانے لکھ دیں گے۔ بحث ہوئی اور طے ہوا لکھو ـــ منٹوں میں ایک لکھ دیا۔ پہلے انھوں نے کہا۔ خراب ہے۔ مگر بعض نے کہا

> اچھا ہے۔ پھر کہا۔ کہیں پڑھا ہو گا اور یاد ہو گا۔ لہٰذا دوا دو لکھ لیے
> اور ان دونوں میں سے دوسرا افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" ہے[1]

اس کے بعد تو ایسا سلسلہ بندھا کہ چغتائی صاحب نے پے در پے کئی افسانے لکھ ڈالے، جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے لیکن ایک بار پھر قارئین کو انھوں نے اپنی طرف متوجہ کیا ایک افسانے سے اس کا نام ہے "کولتار" یہ افسانہ "ساقی" میں شائع ہوا تھا ــــــ اس مختصر سے افسانے کو "ساقی" کے ایڈیٹر جناب شاہد احمد دہلوی صاحب کے مشورے سے چغتائی صاحب نے ناول کا روپ عطا کیا۔ چغتائی صاحب اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں خود ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں:

> "زمانہ بے کاری کے وہ افسانے جو شروع کے چھ مہینے میں لکھے گئے، اُن سے بہتر میں کبھی نہیں لکھ سکوں گا۔ گویا افسانہ نگاری کے لیے بیکاری کو ضروری سمجھتا ہوں"[2]

جناب عظیم بیگ چغتائی صاحب کی ادبی زندگی کی عمر صرف ۱۱ سال ہے، اس قلیل سے عرصے میں چغتائی صاحب نے اردو کو لاتعداد افسانے اور کئی ناول دیے ہیں کہ شاید ہی کوئی دوسرا ادیب ان کی ہمسری

---

[1] مضامین چغتائی۔ صفحہ 87

[2] " " " 81

کر سکے۔ اُن کا ہر افسانہ لاجواب، ایک سے بڑھ کر ایک۔ اپنے اندر ہنسنے ہنسانے کا بھرپور سامان لیے ہوئے ہے۔ ایک بار آپ پڑھنا شروع کر دیں بے ساختہ آپ کے منہ سے ہنسی نکلنا شروع ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ لکھتے ہی کچھ اس انداز سے تھے، جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو۔ واقعہ سُنا رہا ہو۔ اس لیے افسانوں میں بھی ایک کے بعد دوسرا واقعہ اسی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں اور اکثر قاری کو اپنی ہنسی پر قابو پانے کے لیے کتاب ہاتھ سے رکھنا پڑتی ہے۔

چغتائی صاحب اردو ادب کو ایک بہت بڑا قیمتی سرمایہ دے کر 1941ء میں اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ آخر میں بہت بیمار رہے۔ جب تک ہاتھوں نے ساتھ دیا وہ برابر لکھتے رہے۔ یہاں تک کہ انتقال سے چند ماہ پہلے سخت بیماری کی حالت میں انھوں نے افسانہ "برتھ کنٹرول" لکھا تھا۔ شاہد احمد دہلوی صاحب ان کی بیماری اور افسانے کے بارے میں فرماتے ہیں:

> "ایک دفعہ مرزا صاحب کا سخت اصرار ہوا کہ خود بھی آؤ اور بھابھی کو بھی لے کر آؤ ——— تعمیل ارشاد کی گئی۔ اب کے جو انھیں دیکھا تو بڑا دُکھ ہوا۔ اُن کے پاؤں رہ گئے تھے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ بخار ہر وقت رہتا، کھانسی

بہت بڑھی ہوئی تھی، سُوکھ کر قاق ہو گئے تھے، مگر دماغ اسی طرح روشن اور مزاج اسی طرح بشاش تھا ـــــ خوش تو ہمیشہ ہوتے تھے۔ اب کے بہت خوش ہوئے۔ بولے۔ دیکھو! ابھی تم آئے ہو اور ابھی ہماری بیماری جاتی رہی۔ مزے مزے کی باتیں کرتے رہے۔ ہنستے رہے ہنساتے رہے۔ ایک ناول "شراب" لکھنا شروع کیا تھا مگر چند باب ہی لکھ سکے تھے۔ اس کے کچھ حصے سُنائے اور چھاپنے کے لیے دیے۔ رات کو جب دسترخوان بچھا تو کھسک کر ساتھ بیٹھ گئے۔ بھابی وہیں سے چیخیں کہ آپ کچھ نہ کھا لیجیے گا ـــــ " کھائیں گے تو ہم ضرور۔ اب ہم بالکل اچھے ہیں۔ کوئی بیمار تھوڑے ہی ہیں"۔ مجھ سے کہتے جاتے تھے "ارے بھئی یہ ہمیں بھی دو"۔ بھابی جھلاتی تھیں۔ مگر وہ اپنا کام کیے جاتے تھے۔ کھایا تو خیر اُن سے کیا جاتا۔ تھوڑا تھوڑا سا چکھ لیا۔ بارہ ایک بجے تک باتیں کرتے رہے۔ صبح جب مرزا صاحب کو دیکھا تو اُن کی حالت غیر تھی۔ معلوم ہوا سخت بدہضمی ہوئی۔ رات بھر اُدکتے اور ڈکارتے رہے۔ پلیتھن نکل گیا۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ آواز بھی نہ نکلتی تھی۔ دو دن میں طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ ہم بازار سے گھوم پھر کر آئے تو تکیے کے سہارے پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے،

بولے "لو یہ افسانہ تمھارے لیے لکھا ہے۔" پڑھ کر سنایا، عنوان
تھا "برتھ کنٹرول"۔ میں ہنس رہا تھا مرزا صاحب بھی ہنستے جاتے
تھے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ اُن کا آخری افسانہ ہے اور میرے لیے
اُن کی یہ ہنسی بھی آخری!" لہ

اس کے بعد چغتائی صاحب سنبھل نہ سکے، بیماری میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا اور پھر چند ماہ بعد 1941ء میں وہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ اُردو ادب کو ایک بیش قیمتی سرمایہ دے کر۔

لہ نقوش فن و شخصیت نمبر۔ 127 — 128

مرزا عظیم بیگ چغتائی
کی
زود نویسی

مرزا عظیم چغتائی کا شمار اگر اُردو کے زود نویسوں میں کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ انھوں نے تعداد کے اعتبار سے بہت کتابیں لکھی ہیں اور یوں بھی ایک بیٹھک میں بڑے سے بڑا افسانہ مکمل کر لیتے تھے۔ انتہا تو یہ ہے کہ اگر لکھتے لکھتے خود تھک جاتے تو دوسرے کو قلم پکڑا دیتے اور خود بولنا شروع کر دیتے۔ شاہد احمد دہلوی صاحب اپنا تجربہ یوں بیان کرتے ہیں:

"ایک گھنٹے میں انھوں نے کئی صفحے لکھ ڈالے اور پھر بولے میاں بیٹے کھیل چکے۔ لو زرا اب تم قلم لو۔ میرا ہاتھ تھک گیا میں نے قلم سنبھالا وہ بے تکلف بولتے رہے۔ میں لکھتا رہا۔ دو تین صفحے لکھ کر میں نے کہا۔ "بس جی، میں تو لکھ چکا۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ مرغن کھانے کھلاتے ہو، تو سونے بھی دو۔" کہنے لگے "اچھا تو

مچھردانی لگا کر سو رہو۔" عصر کے وقت انھوں نے جگادیا۔" کیا آج چائے نہیں پیو گے ؟" اٹھنا پڑا۔ بولے " افسانہ ختم پر آرہا ہے۔ شام تک ختم ہو جائے گا۔ میں تو چائے پی کر کسی کے ساتھ ٹل گیا۔ مرزا صاحب بیٹھے لکھتے رہے۔ چراغ جلے گھر واپس پہنچا تو بڑے خوش خوش بیٹھے ہوئے تھے، کہنے لگے " لو بھئی یہ افسانہ" اور کوئی چالیس 40 فل اسکیپ کا پلندہ میری طرف بڑھا دیا۔"

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے جن میں افسانوں اور ناولوں کے علاوہ دوسرے موضوعات پر کتابیں اور مضامین ہیں۔ تقریباً 32 کتابوں کے وہ مصنف ہیں، جو اس وقت ملک کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ اور نہ جانے کتنے مضامین، افسانے مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں ——

مرزا عظیم بیگ چغتائی کے لکھنے کا انداز بھی بہت ہی جداگانہ تھا، جو دوسرے مصنفین کے یہاں نہیں پایا جاتا ہے۔ مثلاً اُن کے ذہن میں کوئی موضوع آیا کہ اس کو لے کر افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ بس یہ سوچنے کی دیر تھی کہ قلم اٹھایا اور برداشتہ لکھنا شروع کر دیا۔ اکثر ایک ہی بیٹھک میں افسانہ مکمل کر لیا کرتے تھے۔ شاہد صاحب ایڈیٹر " ساقی"، دہلی مرزا صاحب کے افسانے لکھنے کا حال

لہ نقوش۔ 125

یوں بیان کرتے ہیں :

"بولے سنتے ہو۔ میں ابھی بیت الخلاء گیا تھا تو ایک افسانے کا پلاٹ سمجھ میں آ گیا۔ آج جانے سے پہلے وہ افسانہ لکھ کر دے جاؤں گا ——— لو بس اب اٹھ بیٹھو، منہ ہاتھ دھو ڈالو ——— اتنے میں کہ میں تیار ہوں اور ناشتہ آئے چغتائی صاحب نے آدھا افسانہ لکھ ڈالا ——— ناشتے کے بعد کوئی صاحب اُن سے ملنے آ گئے۔ میں ٹل گیا، کوئی گھنٹہ بھر کے بعد آیا تو اُن کے پاس افسانہ مکمّل تھا۔ [1]

بات یہاں پر آ کر ختم نہیں ہو جاتی ہے، وہ ہر افسانے کی شان نزول بھی بتاتے ہیں کہ کس طرح یہ خیال اُن کے دماغ میں آیا۔

"اس کے بعد انھوں نے اپنے افسانے کی شانِ نزول بتائی کہ کل جو تم نے مجھے اسٹیشن پر نہیں پہچانا تو خاصی پریشانی ہوئی۔ مگر واقعی میری تصویر مجھ سے نہیں ملتی اور بھئی وہ تصویر کس کام کی جو اصل سے مل جائے۔ یہ افسانہ اپنی ہی تصویر پر لکھا ہے، اس کا عنوان ہے "یہ کس کی تصویر ہے" اور اس کے بعد انھوں نے افسانہ سنایا۔ حیرانی ہوئی کہ قلم برداشتہ ایسا شگفتہ افسانہ اور اس کے بعد تو یہ کیفیت

---

[1] نقوش۔ صفحہ 124

دیکھی کہ باتیں بھی کرتے جارہے ہیں اور افسانہ بھی لکھ رہے ہیں۔
عدالت میں مقدمہ بھی پیش کر رہے ہیں اور افسانہ بھی لکھا جا رہا
ہے اور بعد میں یہ معلوم ہوا کہ اس افسانے کے کچھ ورق تو گھر آ گئے
اور کچھ مسل میں لگ کر عدالت کی فائل میں چلے گئے۔" ؎

اس بات کی تصدیق جناب چغتائی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں خود بھی کی ہے۔ اس مضمون کا عنوان ہے۔" میں افسانہ کیسے لکھتا ہوں"

"میری دانست میں میری افسانہ نگاری کا دارومدار واقعات کی
ردوبدل میں ہے۔ میرے افسانوں میں سارا کھیل اسی کا ہوتا ہے۔
اب ظاہر ہے کہ جب حقیقت یہ ٹھہری تو نہ تو میرے اوپر الہامی حالت
طاری ہوتی ہے اور نہ دلکش منظر اثر کرتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجیے
کہ چیف کورٹ کے کمرے میں بیٹھے ہیں، ارد گرد وکیل جمع ہیں، رو
برو چیف جسٹس کسی مقدمے میں منہمک ہیں اور بے کار بیٹھے یہاں
کسی مسل مقدمے کے خالی ورق پر کسی افسانے کے پلاٹ کی پچی کاری
ہو رہی ہے یا پلاٹ قلم بند ہو رہا ہے۔ اردو پڑھنے والا کوئی آیا تو
چھپا لیا ورنہ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کچھ اپنا کام کرتا ہے ——— ایک مرتبہ
ایک اپیل کے کاغذات پر افسانے کا پلاٹ لکھ گیا۔ دوسری طرف

؎ نقوش۔ 124

عذراتِ اپیل تھے ۔ اپیل مع افسانہ پیش ہوگیا۔بہت تلاش
کیا نہ ملا۔عرصہ بعد ایک دفعہ اُسی فائل کا معائنہ کرتا پڑا تو
دیکھتا ہوں کہ اپیل کی پشت پر افسانہ موجود ہے" ؎[1]

یہ زود نویسی کی انتہا ہے، شاید ہی کوئی افسانہ نگار یہ انداز اختیار کرے گا، جو چغتائی صاحب نے اختیار کیا ہوا تھا۔ پے در پے افسانے لکھنے کا کمال صرف چغتائی صاحب کو آتا تھا۔ شاید ہی کسی اور افسانہ نگار نے اس انداز سے افسانے لکھے ہوں۔ جناب شاہد احمد دہلوی کے مضمون کا ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمائیے اس سے آپ کو اُن کی زود نویسی کا اور اندازہ ہوجائے گا۔

"دو تین افسانے تو چغتائی صاحب نے میرے لیے پہلے ہی لکھ رکھے تھے۔کئی افسانوں کے انھوں نے پلاٹ سنائے۔سب اچھے ایک سے ایک عمدہ۔ ایک مارواڑ کا رومان سُنایا "سوانہ کی روحیں" یہ سب سے زیادہ مجھے پسند آیا۔ کہنے لگے تو لاؤ پہلے اسی کو لکھ ڈالیں اور کاغذ قلم لے کر لکھنا شروع کر دیا۔ ایک گھنٹے میں انھوں نے کئی صفحات لکھ ڈالے .... لو بھئی یہ افسانہ .....

..... شاباش ہے مرزا صاحب آپ کی ہمت کو۔ بس کل صبح کی

؎[1] مضامین چغتائی۔صفحہ 48 - 47

گاڑی سے چلا جاؤں گا جانے کے نام سے اُن کا منہ اتر گیا۔ کہنے
لگے۔ نہ جانے کیا بات ہے تم آجاتے ہو تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ کل نہ جاؤ۔ ہم تمھیں دو افسانے اور لکھ
دیں گے۔" لے

مرزا عظیم بیگ چغتائی کے لکھنے کی یہ رفتار دیکھتے ہوئے شاہد احمد دہلوی صاحب کے دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ایک چغتائی نمبر شائع کیا جائے۔ اسی لیے "ساقی" کا "چغتائی نمبر" وہ واحد نمبر ہے جو ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ اس نمبر کی اشاعت کا خیال آتے ہی شاہد صاحب اور چغتائی صاحب کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ ملاحظہ فرمائیے اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کی سادہ لوحی کا لطف لیجیے۔ انھیں اپنے اوپر نمبر نکلوانے میں خوشی بھی ہو رہی تھی لیکن ڈر بھی رہے تھے کہ اگر بکا نہیں تو دوست کا خاصہ روپیہ برباد ہو جائے گا۔

"مجھے تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ میرے پاس چغتائی صاحب
کے تقریباً سَو صفحات کے مضامین ہو جائیں گے۔ اگر سَو صفحات اور
ہو جائیں تو چغتائی نمبر ہی کیوں نہ چھاپ دیا جائے۔ اتنے بڑے
مضمون نگار اور ایسے پیارے دوست کی ایک اچھی یادگار قائم

لے نقوش، صفحہ 125

ہو جائے گی۔ میں نے اُن سے کہا کہ مرزا صاحب تو پھر آپ یوں کیجیے کہ کل تو آپ مجھے جو لکھ کر دے سکیں دے دیں۔ اس کے بعد پندرہ بیس دن میں مجھے چند اور مضامین لکھ دیجیے۔ میں "چغتائی نمبر" چھاپے دیتا ہوں۔ یہ تجویز انھیں پسند آگئی۔ پوچھا "بک بھی جائے گا؟" میں نے کہا "نہ بکنے کی وجہ ـــــ" کہنے لگے ایک ہفتہ میں تمھیں یہ مضامین پہنچ جائیں گے۔" [1]

ان اقتباسات کے مطالعے سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ چغتائی صاحب کس قدر زود نویس تھے۔ بے تکان لکھتے تھے اور کبھی دوبارہ پڑھنے یا دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ جو لکھ دیا بس لکھ دیا۔ وہ حرف آخر ہوتا تھا۔ وہ خود اپنے لکھنے کے طریقۂ کار کے بارے میں فرماتے ہیں :

"جب کوئی مزے دار واقعہ دوست احباب کو سناتا ہوں تو بعض اوقات من وعن سناتا ہوں اور بعض اوقات موقع ومحل کو دیکھتے ہوئے، اس میں ردّ و بدل یا نمک مرچ ملا دیتا ہوں کہ لطف دوبالا ہو جائے۔ جب اس واقعہ کو دس پانچ مرتبہ دوست احباب کے مجمع میں سنا لیتا ہوں تو عموماً دیکھتا ہوں کہ قصہ نئی ترتیب اختیار کرتا جا رہا ہے۔ مگر ہر نئی دفعہ اس میں کوئی مزیدار ردّ و بدل ہو جاتا ہے۔

---

[1] نقوش۔ صفحہ 126

حتیٰ کہ قصہ تیار ہو جاتا ہے۔ اٹھا کر ایک دم لکھ دیا چلیے افسانہ تیار ہو گیا۔ آپ خود خیال کیجیے کہ اس طرح تیار شدہ قصہ لکھنے میں دیر ہی کیا لگ سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بغیر کسی خاص محنت کے میں نے دو سال میں اتنے افسانے لکھ دیے جتنے شاید ہی کسی نے لکھے ہوں۔" ؎

؎ مضامین چغتائی۔ صفحہ۔ ۴۰ - ۴۱

مرزا عظیم بیگ چغتائی
کی
چند اہم تصانیف
کا
تعارف

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے، کتابوں اور مضامین کے مطالعے کے دوران جو حوالے ملتے ہیں، اُن سے اندازہ ہوتا ہے انھوں نے تقریباً 32 کتابیں مختلف موضوعات پر لکھی ہیں۔ جن میں افسانوں کے مجموعہ اور ناولیں بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ لاتعداد مضامین اور افسانے مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں جنھیں سمیٹنا باقی ہے۔ میں، بہت تلاش وجستجو کے بعد 20 کتابیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔ جن میں سے چند مشہور کتابوں کا مختصراً جائزہ پیش کر رہا ہوں تاکہ اس مختصر سے کتابچہ کے مطالعہ سے آپ کو اُن کی طرزِ تحریر اور موضوعات کا اندازہ ہو سکے۔ اصل موضوع یعنی پلاٹ تو اُن کے ہر افسانے اور ناول کا محبّت کے اردگرد گھومتا ہے، لیکن

ہر پلاٹ کے پیچھے کوئی نہ کوئی اصلاحی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ اوپر سے مزاحیہ انداز بیان، کسی بھی پلاٹ میں چار چاند لگا دیتا ہے، جس میں طنز کم اور مزاح زیادہ ہے۔ ظرافت میں، اُن کے باریک مشاہدے اور رنگین تخیل کے علاوہ زبان اور بیان کو بڑا دخل حاصل ہے۔ انھوں نے الفاظ کی الٹ پھیر سے بعض جگہ ایسا مزاح پیدا کیا ہے کہ قاری لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے تکیۂ کلام سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور اس کی تکرار بھی وہ لُطف دیتی ہے کہ قاری اپنی ہنسی نہیں روک پاتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مزاحیہ تحریریں ہلکی پھُلکی ہوتی ہیں، اس میں گہرائی یا وزن نہیں ہوتا ہے۔ یہ بات کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ اور خاص طور پر چغتائی صاحب کی تصانیف پر یہ بات تو بالکل بھی پوری نہیں اترتی۔ اُن تصانیف میں مزاح بھی ہے اور سنجیدگی بھی ہے کیونکہ وہ ایک مقصد کے تحت لکھتے تھے۔

"خانم"

"خانم" مرزا عظیم بیگ چغتائی کے افسانوی ادب کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اِسے ناول کہا جائے یا افسانوں کا مجموعہ۔ یہ بھی ایک دلچسپ سوال ہے کیونکہ اس میں کرداروں کا سلسلہ تو ہے یعنی ایک تعلق سے کردار تو ملتے ہیں۔ نام ایک ہی ہیں۔ حالات ایک ہی ہیں لیکن ہر باب میں ایک نئی کہانی کہی گئی ہے۔ جس کے نتیجہ میں ناول سے زیادہ افسانوی رنگ ابھر آتا ہے۔ ناول جیسا تسلسل تو نہیں ہے مگر کئی افسانوں کو ایک ہی قسم کے یا ناموں کے کرداروں سے ایک کڑی میں باندھ دیا گیا ہے جو اپنے انداز کی ایک نئی اور انوکھی چیز بن گیا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے ناول کے انداز میں پڑھ سکتے ہیں، چاہیں تو کسی ایک افسانے کے انداز میں کسی بھی ایک حصہّ کو الگ اٹھا سکتے ہیں۔

خانم جب منظرِ عام پر آیا تھا تو اس وقت یہ عورتوں اور لڑکیوں میں بہت مقبول ہوا تھا۔ اتفاق سے اس کا دیباچہ بھی اس وقت کی مقبول ترین افسانہ نگار حجاب اسمٰعیل نے لکھا تھا، جو بعد میں حجاب امتیاز علی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ آپ فرماتی ہیں:

"یہ کتاب محض تفریحی افسانوں کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ معاشرت کے بعض دقیق مسئلوں کے حل سے معمور ہے، جن کا تعلق ہماری روزمرہ

کی زندگی سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو دورِ حاضر کا بہترین
اصلاحی افسانہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اسے زیادہ دل نشیں
پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ جسے پڑھ کر پژمردہ سے پژمردہ آدمی بھی دو
گھڑی کے لیے شگفتہ ہو جائے۔" [1]

دراصل "خانم" میں ازدواجی محبت کی رنگین داستان کو بہت حقیقی اور دل نشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جسے پڑھ کر ہر ایک نوجوان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کاش ہماری بھی ایسی ہی زندگی ہوتی یا ہو۔ ہم بھی اپنی ازدواجی زندگی میں ایسے ہی مزے لوٹیں۔ یہ خواہش جگانے کا فن جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی کا اپنا ہے، بس یہی اُن کے ناول "خانم" کی جان بن گیا ہے۔ ہر قاری اُن کے اس جال میں گرفتار ہو جاتا ہے اور بہہ جاتا ہے ان کی دلکش طرزِ تحریر میں —— اور اس سب کے لیے جناب چغتائی صاحب نے آپ بیتی کی تکنیک اپنائی ہے اور ہیرو ان کے اپنے تخیل کا ہیرو ہے۔ جس کے ذریعہ انھوں نے اپنے جذبات کی غمازی کی ہے۔ بقول عصمت چغتائی:

"شاید اوروں کے لیے "خانم" کچھ بھی نہیں لیکن لکھنے والے
کے اور باقی سارے کیریکٹر اور دوست زندہ ہیں۔ بھائی صاحب۔
بھابی جان۔ نانی امّاں شیخانی، والد صاحب، بھتیجے، بھنگی۔ بہشتی

---

[1] خانم۔ صفحہ ۱۱

یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا بالکل یہی اور اب بھی سب گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از کم میرے گھر میں تو تھا اور ایک ایک لفظ گھر کی سچّی تصویر ہے۔ جب عظیم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اُن کے لیے ایکٹنگ کیا کرتا تھا۔ ہم چلتے پھرتے کھلونے تھے۔ وہ ایک نقاش جس نے بالکل اصل کی نقل کردی ہے جتنی دفعہ "خانم" کو پڑھتی ہوں یہی معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کا گروپ دیکھ رہی ہوں۔ وہ بھابی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں۔ وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کررہے اور مصنف خود سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہیں۔" [1]

اس طرح جناب چغتائی صاحب نے اپنے گھر کے افراد کو کرداروں کی حیثیت سے پیش کرکے اس افسانے میں ایک نئی روح بھردی ہے جو حقیقت سے بہت قریب ہوگیا ہے۔ جس سے زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔ الغرض "خانم" نوجوانوں اور خاص طور پر تعلیم یافتہ نوجوانوں کو گھریلو محبّت کے راستے بتاتی ہے اور انھیں گھر کی دلچسپیوں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستانی نوجوان انگریزی پڑھ کر گھروں سے دُور ہو رہے تھے۔ ہوٹلوں اور کلبوں میں اپنا وقت گزارنا پسند کرتے تھے۔ شاید اسے ہی تہذیب مانتے تھے۔

---

[1] چوٹیں۔ صفحہ 148

لیکن چغتائی صاحب نے ایک کتاب کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ گھروں میں سب کچھ موجود ہے۔ جس کی تلاش کے لیے لوگ ہوٹلوں اور کلبوں کا رُخ کرتے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ چغتائی صاحب نے اس بات کی طرف بھی خاص طور پر توجہ دی ہے کہ "خانم" کی عزت کرو۔ اس سے گھر جنت بن جاتا ہے۔ اس کی توہین گھر کو جہنم بنا سکتی ہے۔ "خانم" کی توہین دنیا کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ جو لوگ اپنے گھروں کی عورتوں کی عزت و احترام نہیں کر سکتے، وہ دنیا میں کیا کسی کو عزت دیں گے۔ اس لیے گھر وہ جگہ ہے جہاں سے بہت کچھ سیکھ کر آدمی نکلتا ہے۔ اگر وہ گھر میں "خانم" کو عزت اور احترام بخشتا ہے تو دنیا میں وہ دوسروں کو عزت دے گا۔

الغرض "خانم" کا ایک ایک باب جسے آپ مکمل طور پر ایک افسانہ کہہ سکتے ہیں دلکش اور جاذب نظر ہے۔ بات بات پر چغتائی صاحب آپ کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہی اُن کے فن کا کمال ہے۔ مجموعی طور پر "خانم" کا پلاٹ گھریلو حالات اور کرداروں کے تانے بانے سے تیار کیا گیا ہے جس کو پڑھیے تو قدم قدم پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائیے۔

"چمکی"

"چمکی" میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے ایک عجیب و غریب خود دار عورت کی داستان بیان کی ہے۔ جس کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ اس داستان کو بیان کرتے ہوئے مرزا عظیم بیگ نے اپنا انداز بیان بھی کہانی کی موزونیت کے ساتھ ساتھ بدل دیا ہے۔ اس ناول میں اُن کا اپنا محض ہنسنے ہنسانے والا رنگ نہیں ہے۔ اس سے وہ قدرے مختلف نظر آتے ہیں لیکن ناول کے فن کو برتنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ نتیجہ میں "چمکی" ایک بہترین ناول کی شکل میں سامنے آیا اور بلا شک و شبہ اِسے مرزا عظیم چغتائی کا بہترین ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔ محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ فرماتی ہیں:

"چمکی دہکتا ہوا شعلہ ہے یقین نہیں آتا کہ اس قدر سوکھا مارا انسان جس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ تخئیل میں کس قدر عیاش بن جاتا ہے۔ افوہ۔ وہ چمکی کی خاموش نگاہوں کے پیغام۔ وہ ہیرو کا اس کی حرکتوں سے مسحور ہو جانا اور پھر خود مصنف کی زندگی ــــ کس قدر مکمل جھوٹ ــــ یہ عظیم بھائی نہیں ان کا ہمزاد ہوتا تھا۔ جو ان کے جسم سے دُور ہو کر حسن و عشق کی عیاشیاں کراتا ہے۔" [1]

(1۔ چوٹیں۔ صفحہ 152)

واقعی یہ حسن و عشق کی ہوشربا داستان ہے۔ جس میں چغتائی صاحب نے جنسی جذبات کا سہارا لیا ہے اور ناول کو ضرورت سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے ——— جنسی جذبات سے تو کام لیا ہے لیکن عریانیت سے پرہیز کیا ہے اور پورے ناول میں کوئی بھی حصّہ ایسا نہیں ہے جس پر عریانی کا گمان ہوتا ہو۔ وہ عریانیت سے بہت دُور رہے ہیں۔ انھوں نے عورت کے حسن کو تو ضرور پیش کیا ہے، اس کے جذبات کی عکّاسی کی ہے۔ اس کی اداؤں اور حرکتوں کو پیش کیا ہے، لیکن کبھی اس کے جسم کو دکھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ خیالات میں وہ کچھ ضرور عُریاں ہو گئے ہیں یہ کوئی خاص اور اہم بات اس لیے نہیں ہے کہ اگر جذبات کے اظہار کو بھی عریانی کا نام دیا جائے تو پھر دنیا کی کوئی بھی چیز عریانیت کے دائرے میں آجائے گی۔ اور پھر اس طرح کے جذبات جناب چغتائی صاحب کے دوسرے افسانوں اور ناولوں میں بھی ملتے ہیں۔ مگر "چمکی" میں آپ کا قلم کچھ زیادہ ہی شُوخ ہو گیا تھا:۔

"مجھے چاہتی ہے۔"

میرے سوال کا جواب اس نے نہیں دیا لیکن ایک نظر اٹھا کر عجیب و غریب اور لاچاری سے اس نے دیکھا یا نظروں سے جواب دیا اور میں نے کہا "کیوں ری ——— تجھے گلے لگا لوں اور میں نے دیکھا کہ حجاب کے سبب وہ پانی پانی ہو گئی ——— میں نے دونوں ہاتھ

آغوش میں لینے کے لیے بڑھا دیے، جیسے بچے کو گود میں لینے
کو ہاتھ بڑھا کر بلاتے ہیں اور میں نے کہا" آ، میں تجھے گلے لگا
لوں اور وہ باوجود بار بار تقاضہ کے نہیں آئی تو میں نے ہاتھ
پکڑ کر آہستہ سے اپنی طرف کھینچا اور اس کے جھکے ہوئے چہرے
کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر چوم لیا اور اس جنگلی چیز کو گلے
لگا لیا ـــــ اس نوجوان سینے کی دھڑکن، میرے سینے پر ہتھوڑے
کی طرح لگتی معلوم دی"۔ لہ

الغرض "بچھی" عشق و محبت کی ایک دلکش داستان ہے جسے چغتائی صاحب کے طرزِ تحریر نے ایک شاہکار کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ جو اُردو ادب میں نہ صرف چغتائی صاحب کا بہترین ناول بلکہ اردو ناول کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ ہے۔

لہ بچکی۔ صفحہ 100 ــ 101

"شریر بیوی"

شریر بیوی مرزا عظیم بیگ چغتائی کا پہلا ناول ہے۔ یہ ناول سے زیادہ افسانوں کا مجموعہ محسوس ہوتا ہے کیونکہ مختلف واقعات و حادثات کو چغتائی صاحب نے چند کرداروں کے ذریعہ یکجا کر کے پیش کیا ہے۔ کردار، واقعات اور مناظر کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ سب کچھ جانا پہچانا اور دیکھا بھالا محسوس ہوتا ہے۔ واقعات مختلف ہیں لیکن کردار ایک ہی ہیں اسی لیے ناول کے پلاٹ کا صحیح تصور نہیں اُبھرتا ہے۔

شروع کے ابواب میں تو احساس ہوتا ہے کہ کہانی بن رہی ہے لیکن بعد میں چند واقعات ایسے آجاتے ہیں، جو ناول کے تسلسل کو توڑ دیتے ہیں اور اسی کے نتیجہ میں انجام ندارد ہو جاتا ہے اور "شریر بیوی" ناول یا افسانے کی صنف سے ہٹ کر صرف ایک خاتون کی عجیب و غریب داستان بن کر رہ گئی ہے۔ ایسی خاتون جن میں شرارتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں ——— ان تمام شرارتوں کو چغتائی صاحب نے ایسے انوکھے اور دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے کہ قاری لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ نوجوانی کی شرارتیں، حسن و عشق کی چاشنی کے ساتھ بہت ہی دلکش بن گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اس ناول کے کئی

ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ 1940ء کے آس پاس اس ناول کا ہندی میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

"شریر بیوی" ایک دلچسپ ناول ہی نہیں ہے بلکہ اس میں اصلاح کا پہلو پوشیدہ ہے۔ یہ بات بہت اہم اور قابل ذکر ہے کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا کوئی بھی ناول ہو یا افسانہ ہو، جہاں وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا ہے وہیں اس کے پلاٹ میں یا کسی نہ کسی کردار میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ملے گی، جو معاشرے کی اصلاح کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ناول شریر بیوی میں پردے کے نقصانات کو بہت ہی دلچسپ انداز سے پیش کیا گیا ہے تاکہ لوگ سبق حاصل کریں۔ ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے:

"ایک اسٹیشن پر اصغر نے دیکھا کہ کوئی صاحب کھڑے زنانہ درجے کی کھڑکیاں کھول رہے ہیں۔ بس پھر کیا تھا فوراً لپک کر موقع پر پہنچے ــــ میں کھڑکیاں بند کرتا ہوں اور آپ ہیں جو کھول کھول دیتے ہیں۔

اچھا تو یہ آپ ہیں۔ میں خود تنگ ہوں کہ بار بار کھولتا ہوں اور آپ بند کر دیتے ہیں۔ مارے گرمی کے عورتوں کا برا حال ہے۔ اور آپ کو پردے کی سوجھی ہے ــــ اگر ایسا ہی ہے تو آپ اپنی عورتوں کو کسی اور جگہ بٹھائیے ورنہ لے کر ہی کیوں چلے تھے۔ اجنبی نے کہا۔

مگر جناب کو میں کھڑکیاں نہیں کھولنے دوں گا۔ اصغر نے ایک کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔ جتنا آپ کو حق ہے، اتنا ہی مجھے بھی ہے۔

میں حق وَق کچھ نہیں جانتا اور کھولوں گا، عورتیں نہ ہوئیں جانور ہوگئیں۔

تو کم از کم آپ میری طرف والی کھڑکی رہنے دیجیے، اصغر نے کہا۔

میں آپ کی اور اپنی کچھ نہیں جانتا۔ میں اس کھڑکی کو تو ضرور کھولونگا"

کیونکہ وہی تو ایک ضروری ہے۔ اُس تڑنگے اور ضدی شخص نے کہا۔

آپ نہیں مانتے تو میں اسٹیشن ماسٹر سے کہتا ہوں اصغر نے کہا۔

آپ لاٹ صاحب سے کہہ دیجیے۔ جائیے۔

اسٹیشن ماسٹر اور گارڈ دونوں آئے اور وہ بڑا اور ضدی شخص جیت گیا۔ گرمی اس شدت کی تھی کہ کھڑکی بند کرنا محال تھا۔ مجبوراً اصغر پیچ وتاب کھا کر رہ گیا، اور غصہ بیوی پر اس طرح اتارا کہ ان سے کہا کہ برقعہ کے اوپر ایک چادر اور اوڑھ کر کونے میں ناک لگا کر بیٹھ جاؤ"[1]

---

[1] شریر بیوی۔ صفحہ 92 و 93

"ملفوظات ٹامی"

یہ ایک کتّے کی سرگذشت ہے۔ جسے بہت خوبصورت اور دلچسپ انداز میں، کتّوں کے مختلف افعال و حرکات کے ساتھ مرزا عظیم بیگ چغتائیؒ نے پیش کیا ہے۔ جو ایک بہترین مزاحیہ افسانہ بن گیا ہے۔ اس مجموعہ میں افسانے شامل ہیں، جو ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ کتّوں کے علاوہ دوسرے جانوروں کے اخلاق و عادات پر بھی بڑے انوکھے انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے بڑی کاوش سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانوں کے مقابلے میں کتوں کے اندر عشق کے جراثیم زیادہ پائے جاتے ہیں —— کتوں کی کردار نگاری کرتے ہوئے مرزا عظیم بیگ چغتائی کا قلم اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ —— انھوں نے خاصی مہارت کا ثبوت دیا ہے، جو ان کے گہرے مشاہدے اور وسیع معلومات کا نتیجہ ہے —— مثلاً کتوں کا مناسب جگہ تلاش کر کے پیشاب کرنا۔ اس پر اتنے دلچسپ نتائج اخذ کیے ہیں اور ان کو اس قدر دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے کہ قاری ایک پل کے لیے بھی اپنی ہنسی روک نہیں پاتا ہے۔

غرض "ملفوظات ٹامی" ایک بہت دلچسپ افسانوی مجموعہ ہونے کے ساتھ ساتھ، اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ کتّوں اور جانوروں کے اخلاق وعادات پر شاید یہ واحد کتاب ہے۔ جس کو مرزا عظیم بیگ چغتائی نے مزاحیہ انداز میں لکھا ہے ـــــ کسی اور افسانہ نگار نے کتّوں کو اپنے افسانوں کا موضوع نہیں بنایا ـــ یہ صرف چغتائی کے سوچنے کا دلچسپ انداز ہے، جس نے اس کتاب کو اپنی نوعیت کی سب سے انوکھی اور دلچسپ کتاب بنا دیا ہے اور بلاشبہ "ملفوظات" "ٹامی" کو مرزا عظیم بیگ چغتائی کے خزانے کا ایک بیش قیمت تحفہ کہا جا سکتا ہے۔

خطوط کی ستم ظریفی

یہ ناولٹ ظرافت اور دلچسپ پلاٹ کے اعتبار سے مرزا عظیم بیگ چغتائی کے ناولوں اور افسانوں میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ اس ناولٹ کا تانا بانا چغتائی صاحب نے کچھ اس انداز سے بُنا ہے کہ کردار اور پلاٹ خود بخود ایسی صورتیں اختیار کرتے چلے جاتے ہیں کہ مصنف کو کسی قسم کا مصنوعی مزاح پیدا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ کچھ ایسا فطری انداز چغتائی صاحب نے اپنایا ہے کہ جو کم مزاح نگاروں کو نصیب ہوا ہوگا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ خطوط کی صنف سے چغتائی صاحب نے خوب کام لیا ہے۔ یہ ایک سنجیدہ اور معلوماتی صنف ہے۔ جس میں سنجیدگی سے کوئی بات کہی جاتی ہے یا خیریت بتائی جاتی ہے۔ مرزا غالب نے اسے دلچسپ ضرور بنایا ہے۔ مزاح کی چاشنی اس میں ڈالی ہے۔ مگر جملوں کی حد تک، مرزا غالب کی شوخی اُن کی اپنی تحریر کی شوخی تھی، جو جملوں کی صورت میں نمایاں ہوئی اس نے خط کے فارمیٹ کو نہیں بدلا ـــــ لیکن مرزا عظیم بیگ چغتائی نے خط کا فارمیٹ تو رہنے دیا لیکن موضوع اور مواد کو اس انداز سے لکھا کہ اس نے ایک مکمل افسانے کی شکل اختیار کرلی۔ وہ خطوط کی شکل میں ایک مکمل افسانے کو جنم دیا، اور ایسی

باتوں اور شرارتوں کا ذکر کیا کہ آپ اپنی ہنسی کسی بھی قیمت پر روک نہیں پائیں گے جناب ظفر قریشی صاحب نے "خطوط کی ستم ظریفی" کا دیباچہ لکھا ہے، جس میں آپ فرماتے ہیں :-

"چغتائی صاحب نے اس کتاب میں اس صنف کو پورے اہتمام کے ساتھ ظاہر کیا ہے اور اس قدر مشکل بلکہ سفاک پلاٹ پر افسانہ نگاری، قصہ گوئی اور ظرافت نگاری کا مسئلہ کشور ادب میں جاری کر دیا ہے کہ اتنے کامیاب اسکیچ شاید عزیز باتوں میں بھی کم نظر آئیں گے" لہ

لہ خطوط کی ستم ظریفی - صفحہ ۵

چینی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز

یہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا عظیم مزاحیہ طویل افسانہ ہے جو ایک بیوہ کی مجبور زندگی کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری شادی کے مسائل کو بھی بہت دلچسپ پیرائے میں حل کرتا ہے۔ حالانکہ اس افسانے میں بیوہ کی بے سہارا زندگی کو مرکزیت حاصل ہے لیکن اس کے باوجود جگہ جگہ ایسے حصے ہیں جو قاری کو بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہنسی ہنسی میں جناب چغتائی صاحب نے بیوہ کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کے دیباچہ میں قرآنی آیات اور حدیثوں کے حوالے دیے ہیں تاکہ کسی بھی صاحب کو کوئی اعتراض نہ ہو۔

"سن لو کان کھول کر آج سے تیرہ سو برس پہلے رسول عربی نے پکار کر کہہ دیا کہ بیوہ مختار ہے، وہ جانے اور اس کا کام ——— حضرت بیبیہ اور حضرت بی بی سیدہ سکینہ بنت امام حسین سے سبق لے کر سیکھو اور وہ کرو، جو مسلمان بیواؤں کو کرنا چاہیے اور پھر جو کوئی تمھاری راہ میں حائل ہوا اس کے لیے جہنم ہے۔" [1]

---

[1] چینی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز۔ صفحہ ۸

اس بیان کے بعد مرزا عظیم بیگ چغتائی نے قلم برداشتہ اس افسانے کو لکھا اور وہ مزاحیہ انداز اختیار کیا کہ قاری کو محسوس بھی نہیں ہوتا ہے کہ وہ کسی اہم اور سنجیدہ موضوع پر کوئی افسانہ پڑھ رہا ہے ـــ اس افسانے کو ایک بار پڑھنا شروع کر دیجیے پھر کتاب اس وقت ہاتھ سے چھوٹتی ہے جب افسانہ ختم ہو جاتا ہے۔ اتنا سنجیدہ موضوع اور اتنا ہی دلکش اور دلچسپ طرز تحریر جو بات بات پر قاری کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتا ہے، بہت کم کسی مزاح نگار کے یہاں ایسا افسانہ ملے گا۔ کیونکہ موضوع زبان و بیان پر بہت اثر انداز ہوتا ہے لیکن جناب چغتائی صاحب نے ان دونوں کو اس طرح سے شیر و شکر کیا ہے کہ یہ بات جیسے غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ موضوع کا ساتھ زبان دیتی ہے یعنی موضوع سنجیدہ ہو تو انداز بیان بھی سنجیدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس افسانے میں موضوع سنجیدہ ہے لیکن اس کو مرزا چغتائی نے اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ افسانے کے نام سے ظاہر ہے، وہ بھی قدرے حیران کن ہے یعنی چینی کی انگوٹھی ـــ چینی کی انگوٹھی پہلی بار سُنا ـــ ہیرے کی انگوٹھی ـــ سونے کی انگوٹھی ـــ چاندی کی انگوٹھی جیسے الفاظ تو کانوں میں گونجتے رہے ہیں لیکن پہلی بار چینی کی انگوٹھی کا نام سُنا ہے۔ اب آخر یہ چینی کی انگوٹھی ہے کیا۔؟ آئیے مرزا چغتائی صاحب کی زبانی اس کا حال سنتے ہیں :۔

ٹونڈلا ریلوے اسٹیشن کینٹین پر دو دوست چائے پی رہے تھے کہ :

" زور سے سیٹی بجی گاڑی چھوٹنے کی اور اس نامعقول سیٹی کو سُن کر
ہم دونوں گویا ایک دم جاگ اٹھے اور بھاگے ہم دونوں، مگر
شنذدی بھائی مع چائے کی پیالی کے، جس کا کنڈہ ان کی انگلی میں
پھنس گیا تھا۔ اُدھر ہوٹل والے نے دیکھا کہ مسافر چائے کی پیالی
پار کیے جاتا ہے تو لپکا کر لینا۔
اب ایک وقت میں شنذدی بھائی کے ذمّہ دو کام تھے ۔
ایک تو چائے کی پیالی سے نجات حاصل کرنا جس کا کنڈا ان کی
انگلی میں پھنسا ہوا تھا۔ دوسرے سر پر پیر رکھ کر بھاگنا کہ کہیں گاڑی
نہ چھوٹ جائے ۔ نتیجہ میں ناظرین خود معلوم کرسکتے ہیں کہ سوائے
اس کے اور کیا ممکن تھا کہ کسی عجیب وغریب طریقے سے انگلی میں
چائے کی پیالی کا صرف کنڈہ ہی کنڈہ رہ جائے ۔

اس ایک واقعہ نے افسانے میں وہ جان ڈال دی ہے کہ نہ پوچھیے۔ واقعہ کی شوخی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کی سادہ اور صاف ستھری عبارت بار بار قہقہہ لگانے پر قاری کو مجبور کر دیتی ہے ۔ اس طویل مختصر افسانے کا پلاٹ بہت چست اور گٹھا ہوا ہے۔ بہت ہی ہموار ہے۔ کسی قسم کی ڈھیل یا ناہمواری یا کوئی بات یا واقعہ جو پلاٹ کو کمزور کر دے یا ممکن محسوس ہو

نہیں ہے۔ پھر ایک اہم مسئلہ یعنی بیوہ کی دوسری شادی پر روشنی ڈالتا ہے اور حدیثوں اور قرآنی آیات کی روشنی میں۔ نتیجہ میں ایک مکمل اور جامع افسانے کی صورت میں سامنے آیا ہے جو یقیناً مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے اور جسے اُن کا شاہکار افسانہ کہا جا سکتا ہے۔

"مضامین چغتائی"

مرزا عظیم بیگ چغتائی بہت زود نویس تھے ۔ جو موضوع اُن کے ذہن میں بس جائے پھر وہ اس کو لکھ کر ہی چھوڑتے تھے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مضامین انھوں نے لکھ تو لیے لیکن بعد میں انھیں پسند نہیں آئے اور انھیں اشاعت کے لائق نہیں سمجھا اور انھیں ایک طرف رکھ دیے، کسی رسالے کو نہیں بھیجے اور سوچا کہ انھیں تلف کر دیا جائے گا، جیسا کہ اس کتاب کے دیباچہ سے اشارہ ملتا ہے ـــ یہ وہی تمام مضامین ہیں جو اس کتاب میں شامل ہیں۔

اِن مضامین کی اشاعت کو میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کی جدّت پسندی سے تعبیر کرتا ہوں کہ انھیں خیال آیا کہ کیوں نہ ایک پرانے دستور کو توڑا جائے اور تلف کیے ہوئے مضامین کو شائع کیا جائے کیونکہ اب تک اردو ادب میں یہ روایت ملتی ہے کہ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے کمزور شعری و نثری حصوں کو تلف کر دیا ہے ـــ اس لیے مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اپنے ایسے تمام مضامین یکجا کر کے شائع کر دیے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اِن مضامین کا اُن کے قارئین کیا اثر لیتے ہیں۔

اس مجموعہ میں 23 مضامین شامل ہیں، جو تلف ہونے سے بچ گئے ہیں ۔ یہ مضامین اس مجموعہ میں شامل ہونے سے پہلے کہیں بھی شائع نہیں ہوئے ہیں ،

بس یہ وقت وقت کی بات ہوتی ہے، اس وقت مرزا چغتائی کی نظر میں نہیں بچے اس لیے اشاعت سے رہ گئے ورنہ مضامین میں کسی بھی طرح کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جن کی وجہ سے انھیں تلف کرنے کے بارے میں مرزا چغتائی نے سوچا تھا۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے، جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ انداز ان مضامین میں بھی موجود ہے اور اِن 23 مضامین میں سے تو بہت سے مضامین بہت ہی اہم اور کارآمد ہیں جو ان کے انداز بیان اور لکھنے کے طور طریقے پر روشنی ڈالتے ہیں جس سے اُن کے رہنے سہنے، سوچنے سمجھنے اور کام کرنے کے انداز کا پتہ چلتا ہے ـــــ مثلاً۔ میں افسانہ کیسے لکھتا ہوں ـــــ افسانہ نگاروں کی قسمیں۔ پیام یزید وغیرہ ـــــ

اس کے علاوہ " اردو ہندی کا قصہ۔ سونے اور چاندی کی داستان۔ کیا وکالت جرم ہے وغیرہ وغیرہ مضامین قابل ذکر ہیں اور اردو ادب کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔

"مرزا جنگی"

"مرزا جنگی" ایک ڈرامہ ہے، جو فن کے لحاظ سے کوئی بہت اچھی چیز نہیں ہے۔ اکثر جگہ پر ڈرامائی کشمکش کا فقدان محسوس ہوتا ہے اور ڈرامہ اپنے دائرے سے نکل کر افسانے کے حدود میں داخل ہو جاتا ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے یہ ڈرامہ ایک بہترین طنزیہ ڈرامہ ہے کیونکہ اس میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب پر ایک زبردست چوٹ کی ہے اور لکھنؤ حکومت (سلطنت) کے آخری دور کا نقشہ بہت ہی مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا ہے اُس زمانے کی روایتی شان آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ لکھنؤ کے بانکے نوابوں اور شہزادوں کے مسائل کو اس قدر طنزیہ انداز میں بیان کیا ہے کہ پڑھتے پڑھتے قاری دانتوں میں انگلی دبا لیتا ہے ــــــ یہ حقیقت ہے کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا مزاحیہ انداز اپنے شباب پر ہے، جو ڈرامے کو ایک نیا رنگ عطا کرتا ہے اور فنی نقطۂ نظر سے ہٹ کر ہنسنے ہنسانے کا خاصہ مواد فراہم کرتا ہے۔ خاص طور پر وہ منظر بہت ہی زیادہ دلچسپ ہے جب بانکے مرزاؤں کی فوج دشمن سے لڑنے کی تیاری کرتی ہے اور پھر جب توپ بھرنے کا حکم ہوتا ہے تو اس میں سے بلّی کے بچے نکلتے ہیں ــــــ ڈرامہ خاصہ کمزور ہے لیکن مرزا چغتائی کا مزاحیہ انداز اپنے شباب پر ہے اور لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب کی بہترین عکاسی کی ہے۔

سوانہ کی رُوحیں

مرزا عظیم بیگ چغتائی کا ایک بے مثال شہ پارہ ہے۔ یہ ناولٹ اپنے انداز کا انوکھا ناولٹ ہے کیونکہ موضوع کے اعتبار سے ایک رومانی ناولٹ ہے۔ انداز یا طرز تحریر بہت ہی مزاحیہ ہے لیکن انجام المیہ ہو جاتا ہے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اس سنجیدہ اور ٹریجڈی کہانی کو بہت ہی نرالے انداز سے لکھا ہے۔ ویسے یہ کہانی کوئی نئی تخلیق نہیں ہے۔ یہ مارواڑ کا ایک قدیم رُومانی قصّہ ہے، جس کو مرزا چغتائی نے اپنے انداز سے بیان کیا ہے اور اس میں اپنے مذاق اور مزاج کی مناسبت سے مزاحیہ رنگ بھرا ہے تاکہ یہ سوکھا اور خشک ٹریجڈی ناولٹ نہ بن کر رہ جائے۔

"سوانہ کی روحیں" میں راجپوتوں کی جرأت کے کارناموں اور حسن کی رعنائیاں اور محبت کی سحرکاریاں سب کچھ موجود ہیں، جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور قاری مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بُنے ہوئے جال سے اس وقت آزاد ہوتا ہے جب ناولٹ ختم ہو جاتا ہے ___ ایک ظرافت نگار کے قلم سے دل ہلا دینے والا ٹریجڈی افسانہ ایک نئے ہی انداز سے قاری کو متاثر کرتا ہے اور ایک نئی چیز اس کے سامنے آتی ہے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا انداز اس قدر

متاثر کن ہے کہ قاری اپنے آنسو نہیں روک پاتے ہیں۔ یہ ناولٹ جناب شاہد احمد دہلوی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ کیونکہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا لکھنے کا ایک عجیب انداز یہ بھی تھا کہ وہ نوٹس بنا لیا کرتے تھے۔ یعنی جب جس کہانی کا پلاٹ ذہن میں آیا اس کا خاکہ لکھ لیا اور پھر جب فرصت ملی یا جی چاہا اس کو افسانے کی شکل عطا کر دی۔ جب شاہد احمد دہلوی صاحب جودھپور گئے اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کے مہمان ہوئے تو انھوں نے بہت سے افسانوں کے خاکے سنائے اور سب سے زیادہ شاہد احمد دہلوی صاحب نے ''سوانہ کی روحیں'' کے خاکے کو پسند کیا اور مرزا چغتائی نے فوراً قلم اٹھا کر لکھنا شروع کر دیا۔ شاہد احمد دہلوی صاحب نے اس ناولٹ کا دیباچہ لکھا ہے وہ اپنے دیباچہ میں فرماتے ہیں :۔

''سوانہ کی روحیں مرزا صاحب کی حزن نگاری کا شاہکار ہے۔ کہانی اتنی دلکش ہے کہ غالباً اُن کی کوئی کہانی اتنی دلکش نہیں ہے۔ مارواڑ کے رزم و بزم کے واقعات اور اس کی حسین تصویر کشی کے لحاظ سے یہ چھوٹی سی کتاب اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے اور غالباً آخری بھی۔ کیونکہ اب سرزمین مارواڑ کو مرزا چغتائی جیسا سپوت میسّر نہیں آسکتا''[1]

---

[1] سوانہ کی روحیں۔ صفحہ 3

"کمزوری"

ایک حسرتناک المیہ ناول ہے لیکن مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اپنی ظرافت نگاری کا جادو اس میں بھی جگایا ہے اور ابتداء میں یہ ایک مزاحیہ ناول کی طرح سے شروع ہوتا ہے لیکن دھیرے دھیرے حالات اور واقعات کی مناسبت سے زبان و بیان بھی سنجیدہ ہوتا جاتا ہے اور آخر میں المیہ کے رُوپ میں ختم ہو جاتا ہے ۔۔۔

مرزا عظیم چغتائی کا فن اس ناول میں اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔ کیونکہ پلاٹ بہت مضبوط ہے اور ایک ایسے واقعہ پر مبنی ہے جو آئے دن ہماری زندگی میں پیش آتا ہے اور اس طرح کے واقعات ہماری سوسائٹی کے لیے ایک لعنت ہیں۔ اسی لیے مرزا چغتائی نے اسے صرف نوجوان لڑکیوں کے لیے لکھا ہے تاکہ وہ اس ناول کے مطالعہ کے بعد اپنی کوئی رائے قائم کر سکیں اور انھیں دنیا کے حالات اور واقعات کا علم ہو سکے کہ ایسا بھی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔ یہ اہم واقعہ زناکاری کا واقعہ ہے۔ جس کے ذریعہ ایک زبردست عبرت کا درس دیا ہے۔ ایسا درس جو بڑے بڑے مولوی اپنے وعظ و پند سے نہیں دے سکتے تھے۔

الغرض یہ ایک اصلاحی ناول ہے۔ جو عورتوں کو زنا جیسے معاملات میں اپنی رائے کی تشکیل میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

ویمپائر

"کمزوری" کی طرح یہ بھی ایک عبرتناک داستان پر مبنی ناول ہے، جو ایک پاکباز لڑکی کی کہانی ہے، جو عجیب و غریب حالات کا شکار ہو کر ایک بدخصال آدمی کے جال میں پھنس جاتی ہے اور وہ اسے اپنی رکیک ترین خواہشات کی تسکین کے ذریعہ ماں بنا دیتا ہے ـــ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے بہت خوبصورتی اور برجستگی سے اس لڑکی کے جذبات کو پیش کیا ہے کہ ہر قاری کی ہمدردی اس لڑکی کے ساتھ ہو جاتی ہے اور وہ قابل رحم محسوس ہوتی ہے۔ جب اسے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ وہ ماں بننے والی ہے تو وہ اپنی ہستی کو قابل نفرت سمجھ کر خودکشی کرنے کا ارادہ کرتی ہے لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہو پاتی ہے۔

تعلیم نسواں کا آج گھر گھر چرچا ہے، ہر گوشے سے آواز بلند ہو رہی ہے اور آج کی عورت خود بھی اپنی آزادی کے لیے کوشاں ہے لیکن آج سے چالیس سال پہلے مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اپنی اس ناول "ویمپائر" کے ذریعہ سے عورتوں اور لڑکیوں کو آگاہ کیا تھا کہ ایک ذرا سی لغزش کے بعد کس قدر مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بہت سی لڑکیاں ایسی ہیں جو ماں کے فرائض کیا ہیں جاننے سے پہلے ہی ماں بن جاتی ہیں ـــ ایسی لڑکیوں کے لیے یہ بہت ہی سبق آموز ناول ہے۔ جس کا مزاحیہ رنگ قاری کو بور نہیں ہونے دیتا اور مرزا چغتائی ہنسی ہنسی میں بہت سی باتیں کام کی کہہ جاتے ہیں۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی
کی
تصانیف کی فہرست

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی زود نویس افسانہ اور ناول تھے۔ یوں تو ان کو اردو ادب والے ایک افسانہ نویس اور ناول نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن انھوں نے مختلف موضوعات پر برجستہ قلم اٹھایا اور بہت خوب لکھا۔ خاص طور پر "قرآن اور پردہ" یا "پردہ اور حدیث" وغیرہ پر برمحل اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کیونکہ آپ پردے کے سخت مخالف تھے۔ اِن دونوں کتابوں نے ایک ہلچل مچادی اور بہت سے لوگ مرزا چغتائی کے مخالف بھی ہوگئے۔ بہرحال لوگوں کے سمجھانے پر انھوں نے اپنی توجہ مذہب کی طرف سے ہٹائی اور ناول اور افسانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ مجھے جو کتابیں مرزا عظیم بیگ چغتائی کی دستیاب ہو سکی ہیں ان کی تعداد 32 ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ اور کتابیں ہوں، جو میری نظر سے چھوٹ گئی ہوں۔ اس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں۔

ناول

1. شریر بیوی
2. فل بوٹ

3 - چمکی   4 - مسز کرڈھلے
5 - کولتار   6 - ویمپائر
7 - کمزوری   8 - کھریابہادر

افسانوں کے مجموعے

1 - رُوحِ ظرافت - 2 - روحِ لطافت - 3 - خانم - 4 - قدردان - 5 - پھریری - 6 - انگوٹھی کی مصیبت - 7 - چغتائی کے افسانے I اور II

ناولٹ اور طویل مختصر افسانے

1 - قرض، مقراضِ محبت است - 2 - لفٹیننٹ - 3 - جنّت کا بھُوت - 4 - دیکھا جائے گا - 5 - سوا نہ کی روحیں - 6 - چینی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز - 7 - خطوں کی ستم ظریفی - 8 - ملفوظات اور 9 - شہزادی -

ڈرامہ = 1 - مرزا جنگی -

مختلف موضوعات پر کتابیں

1 - قرآن اور پردہ - 2 - حدیث اور پردہ - 3 - رقصِ سرور - 4 - آدم خور - 5 - ملفوظاتِ ٹامی - 6 - مضامینِ چغتائی -

مرزا عظیم بیگ چغتائی

کے خیالات، افسانہ نویسی کے بارے میں

مرزا عظیم بیگ چغتائی کا اپنا ایک نرالہ ہی انداز تھا افسانہ لکھنے کا، جو عام افسانہ نگاروں سے قدرے مختلف تھا، اس لیے اکثر سوال یہ پیدا ہوتا تھا تو انھوں نے خود اس کا جواب لکھ دیا ایک مضمون کی شکل میں جس کا عنوان ہے "افسانہ کیسے لکھتا ہوں" یہ ایک بہت طویل مضمون ہے، جس کے چند اقتباسات اور اہم حصے نقل کر رہا ہوں تاکہ قارئین مرزا عظیم بیگ چغتائی کے خیالات سے آگاہ ہو سکیں اور اُن کے افسانہ لکھنے کے طریقے کو سمجھ سکیں۔

ناول یا افسانہ کا سب سے اہم حصّہ پلاٹ ہوتا ہے اس کے بارے میں مرزا عظیم بیگ چغتائی فرماتے ہیں :-

"ایک پلاٹ پر میں لکھوں تو اور چیز بن جائے اور آپ لکھیں تو دوسری چیز بن جائے۔ ان ہی خیالات و رجحانات سے میرے افسانے کی ترتیب و تعمیر ہوتی ہے۔" [1]

---

[1] مضامین چغتائی۔ صفحہ 56 -

اب میں وہ اصول نقل کرتا ہوں جو مرزا عظیم چغتائی نے اپنے مضمون " افسانہ کیسے لکھتا ہوں" میں بیان کیے ہیں۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہو جائے گا کہ مرزا چغتائی کے لکھنے اور سوچنے کا کیا انداز ہے:۔

1 میں افسانے کو ختم کرنے کی اُلجھن میں کبھی نہیں پڑتا۔

2 میں نے اپنے افسانوں میں "پھر کیا ہوا" کا جواب قلم بند کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی ــــ کہانی کو اس موقع پر لا کر چھوڑ دیتا ہوں کہ نتیجہ خود پڑھنے والا سمجھ لے کہ کیا ہوا۔

3 افسانہ میں بائرن کا مقررانہ جوش لانا پسند کرتا ہوں۔ کیٹس کی حُسن وعشق کی گرمی واقعات سے پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آغا حشر کے تھیٹریکل رنگ سے دُور رہتا ہوں۔

4 افسانے میں مزاحیہ رنگ واقعات سے پیدا کرنے میں لُطف آتا ہے۔

5 پریم چند کو پہلا فوٹوگرافر سمجھتا ہوں۔

6 جہاں تک موجودہ دور کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے کیمرے کو پہلے اُٹھانے والا سوائے ڈاکٹر نذیر احمد کے کوئی اور نہیں۔

7 شرر کے تضیع اوقات سے مجھے ہمدردی رہی ہے اور تاریخ کو قتل کرنے کا ماتم بھی ــــ وہ ناول نویسی کے پائینر اور امام تھے۔

8۔ جاسوسی ناولوں کے پڑھنے اور لکھنے سے دم الٹتا ہے۔

9۔ معاشرے کی تمام خرابیوں کا ذمّہ دار مولویوں کو خیال کرتا ہوں۔ افسانے کی ہر برائی کی جڑ آخر میں اُن سے ملاتا ہوں۔ مولویوں سے میری مراد حضرات علمائے کرام نہیں بلکہ جاہل مولوی ہیں۔

10۔ میرے افسانوں میں باغ، مکان، جنگل، چھت جو کچھ بھی ہیں، وہ سب میرے دیکھے ہوئے ہیں، کوئی شے خیالی نہیں ہے۔

11۔ افسانوں میں عشق و محبت کی گرمی اور جذبات خود میرے اپنے مشاہدے اور تجربات میں آئے ہوئے ہیں۔ حسُن وہ ہے، جو میں نے دیکھا ہے اور محبت وہ ہے، جو خود میں نے دیکھی اور سمجھی ہے اور عورت وہ ہے جسے میں نے خود دیکھا اور سمجھا ہے۔ اپنے افسانوں میں حُسن دیکھتا ہوں دکھاتا نہیں ہوں۔

12۔ مکالمہ وہ ہے جو خود میں نے کہا ہے۔ حتّٰی کہ بعض مواقع پر لکھنے سے قبل خود بول کر اور جواب لے کر دیکھ لیتا ہوں۔

13۔ عشّاق سے للّٰہی بغض ہے۔

14۔ اپنے افسانوں کی عورتوں کو حتی الوسع معمولی عورتوں سے بڑھنے یا گرنے نہیں دیتا۔

15۔ قصہ کو اپنی مرضی پر نہیں لے جاتا۔

16۔ میرا تجربہ ہے کہ کسی واقعہ پر اگر افسانہ لکھا جائے تو ضرورت ہے کہ لکھنے کے بعد اُسے دس دفعہ اُلیٹے پلیٹے ـــــ اس طرح سے وہی پلاٹ اور وہی قصہ عجیب

و غریب طریقے پر مٹی سے سونا ہو جاتا ہے ـــــ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھوں نے مجھے ایسا کرتے دیکھا ہے یا خود اپنے افسانوں کے ساتھ کر کے دیکھ لے۔

17۔ معاشرتی افسانے لکھنے کے لیے اور تحریر میں پاکیزگی کے لیے، میری دانست میں افسانہ نویسی کا کوئی صحیح مرکز عشق و محبت بھی ہونا چاہیے تاکہ اس کی عشقیہ تحریروں میں چھچھلے کی معاشرت نہ پیدا ہونے پائے۔

18۔ ایک بدچلن افسانہ نویس، جس کے حسن و عشق کا کوئی صحیح مرکز ہی نہیں۔ سوائے بیہودگی کے کچھ نہ لکھ سکے گا۔

19۔ ہندوستان کو میں نقّادوں سے خالی سمجھتا ہوں۔

یہ ہیں وہ چند خیالات جو مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اپنی افسانہ نویسی کے بارے میں تحریر کیے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے اور ہمیں ان کی تحریروں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے ہر افسانے اور ناول میں مزاحیہ رنگ غالب رہا ہے لیکن اصلاحی پہلو کو انھوں نے کبھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اور یہی اُن کی تصانیف کا اصل مقصد تھا۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی
کی اَدبی خدمات کا مختصر جائزہ

بیسویں صدی میں جو مزاح نگار ابھر کر اردو دنیا پر چمکے ہیں، ان میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کا نام بہت ادب و احترام سے لیا جاتا ہے کیوں کہ وہ اُن مزاح نگاروں میں سے ہیں جو عملی مذاق سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے عملی مذاق کا سب سے اہم اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ خود بہت کمزور اور بیمار انسان تھے۔ جسمانی طور پر وہ مچلتی ہوئی زندگی کے رقص میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ بہر حال انسان تھے اور زندگی کے ہر رنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور سینے میں ایک مچلتا ہوا دل بھی رکھتے تھے، اس لیے ان کا بھی جی چاہتا تھا کہ وہ بھی ہنسیں کھیلیں دوسروں کی شرارتیں کریں — اسی لیے انھوں نے اپنے افسانوں کے لیے عملی مذاق کا راستہ اختیار کیا۔ اپنے جذبات اور خیالات کو اسی طرح سے اپنے افسانوں میں پیش کیا، جیسا وہ کرنا چاہتے تھے اور یہی انداز عملی مذاق کہلایا۔ شریر بیوی، کولتار، فسل بوٹ، خطوط کی ستم ظریفی، جنت کا بھوت ایسے ناول ہیں کہ جن کے مطالعہ کے

دوران ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں اور قاری بے اختیار فلک شگاف قہقہے لگانے لگتا ہے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے :۔

" میں معمّہ نہیں سمجھتا۔ چیخ کر والدصاحب نے کہا۔ مت بکواس کرو۔ فضول، تو پھر گستاخی معاف۔ بھُوت صاحب نے کہا —— جو آپ کو منظور ہے، وہ خود فریقِ ثانی کو منظور نہیں اور ایسی صورت میں ...... میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں یا اللہ موت آجائے۔ مَیں چارپائی پر سناٹے میں آ کر گر پڑی۔

والدصاحب نے گرج کر کہا۔ کیا خرافات بکتے ہو نالائق۔

خرافات نہیں بکتا —— بھُوت صاحب نے پھر اُسی جوش و خروش سے کہا —— قبلہ ذرا غور فرمائیے —— میرا نام بھُوت رکھا گیا ہے۔ مجھے کلموئے کا خطاب دیا گیا۔ مجھے گھر سے نکالنے کی ہر ممکن تدبیر عمل میں لائی گئی ہے۔ مجھے پھکنیاں مارنے کی دھمکی دی جاتی ہے —— ایک ضابطہ اور قاعدے کے ساتھ مجھے کھانے میں کنکر، پتھر، مٹی اور کوڑا دیا جاتا ہے۔ لاکھ اپنی مرضی مگر ایسی صورت میں کہ خود دوسرے فریق کا کیا خیال

والدصاحب تصویرِ حیرت بن گئے اور بات کاٹ کر چلائے —— کیا واہیات بکتے ہو —— بھُوت کس نے تمھارا نام رکھا —— کیا جنّت نے۔ ؟

جی ہاں — بھوت صاحب چیخ کر بولے۔ میرا نام بھوت رکھا گیا ہے۔

والد صاحب ایک دم ہنس پڑے — پھر تم نے اُسے مارا کیوں نہیں — کس قدر اُلّو ہو تم — پھر والدہ صاحبہ کی طرف مخاطب ہو کر بولے — کیوں جی کیا چُھکنی مارنے کو کہتی ہے —

پھر بھوت صاحب نے بڑی تیزی سے کہا — قبلہ و کعبہ چمٹے دکھاتی ہیں — گھونسے مارنے کو کہتی ہیں اور دانت پیستی ہیں اور پھر ہر دم....

والد صاحب نے ایک دم قہقہہ لگایا — واللہ تم ہو ہی اسی لائق۔ ضرور بیوی کی جوتیاں کھاؤ گے۔" [1]

اسی عملی مذاق اور انداز بیان کی وجہ سے دُنیائے ادب میں "مصورِ ظرافت" کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ یہ خطاب مرزا عظیم بیگ چغتائی کے لیے بہت مناسب اور موزوں ہے کیونکہ اُن کی تمام تر تخلیقات ظرافت سے بھری پڑی ہیں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ صرف انھوں نے ہنسنے ہنسانے تک ہی اپنے افسانوں اور ناولوں کے دائرے کو محدود رکھا ہے بلکہ قدرت کے اصول کے مطابق دنیا میں رنج و غم دونوں پہلو ہر شخص کی زندگی میں آتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں المیہ اور مزاحیہ دونوں پہلوؤں کو شیر و شکر کر دیا ہے۔ جہاں اُن کے

[1] جنّت کا بھوت۔ صفحہ 53 - 56

ناول قاری کو بے تحاشہ قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں تو وہاں کبھی کبھی قاری اپنے آنسو روک نہیں پاتا ہے ـــــ دراصل مرزا عظیم بیگ چغتائی المیہ رومان لکھنے میں بھی بہت ماہر تھے۔ شوخیٔ تحریر اپنا الگ رنگ جماتی تھی لیکن کہانی پر پکڑ اتنی مضبوط ہوتی تھی کہ قاری فرضی کرداروں کی حرکات اور احساسات کو اپنے جذبات سے ہم آہنگ کر کے رو دیتا تھا اور قہقہے آنسوؤں میں ڈوب جاتے تھے ـــــ کولتار کا مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوان لڑکیاں خوش اور بے فکر نظر آتی ہیں اور اُن کی شوخی و شرارت، ان کی عمر کا تقاضہ ہے ـــــ لیکن جب وہ سماج کی بنائی ہوئی شاہراہ پر چلتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ دُنیا کس قدر تنگ اور خطرناک ہے۔ ازدواجی زندگی کے لُطف سے لُطف اندوز ہونے سے پہلے کانٹوں پر گھسٹنا پڑتا ہے۔ تب کہیں پھولوں کی سیج نصیب ہوتی ہے۔

اسی طرح ”ویمپائر“ دہارانی کا خواب۔ کھرپا بہادر اور کمزوری کے آخری حصوں میں وہ اتنے سنجیدہ ہو گئے ہیں کہ ان کے پاس جتنے آنسو ہیں سب بہا دیجیے گا۔

لیکن مرزا عظیم بیگ چغتائی کا اصل رنگ ظرافت ہے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ انھوں نے حزن نگاری میں بھی کمال کر دیا ہے ـــــ خوشی اور غمی انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں اور جن کی خوبصورت اور بہترین عکاسی مرزا عظیم بیگ چغتائی کے افسانوں اور ناولوں میں ملتی ہے ـــــ اسی ملے جلے امتزاج نے

ان کے ناولوں اور افسانوں کو ایک نئی زندگی بخشی ہے۔

ظرافت میں جو ملکہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کو حاصل ہے وہ دوسروں کو کم ہی نصیب ہوا ہے اور اس طرح کی مہارت حاصل کرنے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنی تربیت کی ضرورت ہے، جو مرزا چغتائی کو اپنے خاندان میں خود ہی مل گئی۔ کیونکہ وہ ذہین ضرورت سے زیادہ تھے، اس لیے اپنی ذہانت کا پورا فائدہ اٹھایا اور بات میں سے بات کچھ اس طرح پیدا کی کہ کتاب اس وقت چھوٹتی ہے جب ختم ہو جاتی ہے۔ ذرا چانٹے کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:۔

"قبل اس کے کہ میں قصّہ بیان کر دں، ضروری ہے کہ کچھ "چانٹے" یا "تھپڑ" کی اقسام و ماہیت پر بحث کر دں ـــ پنجاب سے لے کر دکن تک اگر ہاتھ کسی گال پر مارا جائے یا گال کسی کے ہاتھ پر مارا جائے تو کہا جاتا ہے کہ چانٹا مارا یا چانٹا پڑا ـــ لفظ چانٹا بہت عام ہے ـــ چانٹے کے لا تعداد اقسام ہو سکتے ہیں ـــ چانٹا وہ ہے جو غصّہ میں کسی کے گال پر عرض کیا جائے ـــ لازمی ہے کہ چانٹا آواز کے ساتھ سرزد ہو۔ ایک پٹاخے کی آواز کا مفہوم لیے ہوئے۔ اس کا ہم معنی اور ہم مطلب لفظ کسی طرح نہیں ـــ کیونکہ تھپڑ میں لازمی طور پر پٹاخے کی آواز مفقود ہے۔ وہ آواز جس کا تعلق محض انگلیوں ہی سے ممکن ہے۔ تھپڑ میں بدقسمت گال پر علاوہ ہاتھ کی انگلیوں کے کچھ حصّہ

ہتھیلی کا بھی پڑتا ہے، جو آواز کی لطافت کو کھو دیتا ہے مگر ضرب البتہ بھاری پڑتی ہے۔

انگلیوں کے نشان گال پر ایک تھپڑ میں پڑنا لازمی نہیں ہیں لہٰذا آپ نے دیکھا کہ تھپڑ اور چانٹے میں زمین و آسمان کا فرق ہے — چانٹے کا ہم معنی لفظ "طمانچہ" ہے، مگر اس میں وہ تیزی نہیں جو چانٹے میں ہے۔ پھر طمانچہ برابر والوں پر استعمال نہیں ہوتا۔ عموماً بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کے لیے مخصوص ہے — تھپڑ کو بعض لوگوں نے "لپڑ" بھی کہا ہے۔ یہ لفظ غیر فصیح ہے — غرض اس قسم کے اور بہت سے الفاظ ہیں چنانچہ انھیں الفاظ میں سے ایک نہایت عامیانہ "زناٹہ" ہے۔ یو، پی سے اُتر کر شاید بھوپال کی طرف بولا جاتا ہے۔ اس بھوپالی "زناٹے" میں برق رفتاری اور انتہائی تیزی و تندی اس قدر زیادہ موجود ہے کہ بیان سے باہر — دراصل یہ چانٹا ہے ایک بے حد تیز قسم کا۔ بوجہ اپنی رفتار کی تیزی اور زناٹے کے چانٹے اور طمانچے کی مخصوص چٹخدار آواز پر اس کی تیزی کا زناٹا غالب آجاتا ہے۔ گو ویسے چانٹا ہونے کی وجہ سے اس میں چانٹے کی مخصوص آواز ضرور موجود ہے اور وہ بدرجۂ اتم۔ لہٰذا "زناٹا" وہ چانٹا ہے جس میں ایک چانٹے کی تمام خطرناک طاقتیں موجود ہوں"[1]

[1] چینی کی انگوٹھی۔ صفحہ 11 - 12

اس طرح کا ایک اور انداز "تکیۂ کلام" کی شکل میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کے افسانوں میں ملتا ہے۔ ایک مخصوص لفظ کا برجستہ اور برمحل استعمال افسانے میں سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے، " دیکھا جائے گا"، مرزا عظیم بیگ چغتائی کا ایک بہترین افسانہ صرف اسی لیے بن گیا ہے کہ اس میں اس چھوٹے جملے " دیکھا جائے گا" کا اس خوبصورت اور برجستہ استعمال جگہ جگہ کیا گیا ہے کہ قاری کے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں اور اصل کہانی سے زیادہ قاری کو اس جملے کے برمحل استعمال پر لطف آتا ہے۔ یہ مزاحِ خفی کہلاتا ہے جو مرزا عظیم بیگ چغتائی کے اکثر افسانوں میں ملتا ہے اور ان میں ایک نئی زندگی اور نئی لہر پیدا کر دیتا ہے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے تکیۂ کلام کے علاوہ کرداروں کی ناہمواری سے فائدہ اٹھا کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً زن مرید شوہر ناول " خانم "، میں اپنی چنچل بیوی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے عجیب و غریب مضحکہ خیز حرکات کرتا ہے تاکہ اپنی بیوی کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ دراصل مرزا عظیم بیگ چغتائی نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایک زن مرید شوہر کو اپنی بیوی کی خوشی کی خاطر کیا کیا کچھ کرنا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے ایک نیم مزاحیہ کردار وجود میں آگیا ہے، جو پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔

"کیا ایک شوہر کا یہ اولین فرض نہیں ہے کہ اپنی چہیتی بیوی کی خوشی

میں شریک ہو۔ کیا بیوی کے رنج وغم اور ہنسی اور خوشی میں
شوہر کا شریک ہونا لوازمات میں نہیں ہے۔

ضرور ہے اور بالضرور۔ سچے دل سے بیوی کی ہر خوشی میں شریک
ہونا چاہیے۔ لہٰذا مجھ کو سچے دل سے مجبوراً خوش ہونا پڑا ——
چنانچہ فوراً ہی میں نے سب سے پہلے خانم کی اس رائے سے اتفاق
کیا —— خوشی کا موقع ہے۔ سخت خوشی کا مقام ہے۔ جتنا خوش
ہوا جائے کم ہے —— خدا نے خود ہمیں خوشی کا دن دکھایا ہے ——
خدا نے خود ہمیں ایک ننھا منا چاند سا سالا عنایت کیا ہے۔ ہم کیوں
نہ خوش ہوں ہماری خانم خوش، ہم خوش۔" [1]

خانم اور زن مرید شوہر کے انداز کے کردار مرزا عظیم بیگ چغتائی کے
ناولوں اور افسانوں میں جگہ جگہ مل جائیں گے جو قاری کی دلچسپیوں میں اضافہ
کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے ہمیشہ اپنے ناولوں
اور افسانوں کے لیے جو مواد حاصل کیا وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے حاصل
کیا ہے۔ جو کچھ دیکھا اسے اپنے مخصوص اور مزاحیہ انداز میں پیش کر دیا ہے۔
اس کی ایک بہترین مثال "ملفوظات ٹامی" ہے۔ جسے سنجیدہ ظرافت
کی بہترین کتاب کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں "کتے" کی سرگذشت کو جس

---

[1] خانم۔ صفحہ۔ 130

خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے، شاید ہی کسی اور نے اپنے افسانوں کا موضوع کتے کو بنایا ہو۔ پطرس بخاری نے صرف کتوں کی فطرت پر ایک بہت دلچسپ خاکہ لکھا ہے لیکن مرزا عظیم بیگ چغتائی نے تو ان تمام جانوروں کا بہترین نقشہ پیش کیا ہے جو انسانوں کے آس پاس رہتے ہیں۔ مُرغی، بکری، بلّی اور کتّے وغیرہ اسی کے ساتھ مرزا چغتائی نے بہت کاوش سے یہ بات ثابت کی ہے کہ ان جانوروں میں محبت کے جراثیم انسانوں سے کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کی عادات وخصائل کا بہت گہرائی سے مطالعہ کر کے اُن کے کردار کا حصہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اوپر سے انھیں خطابات سے نوازا ہے۔ جو قاری کی دلچسپی میں اضافہ کر دیتا ہے۔ مثلاً کتّوں کا جگہ تلاش کر کے پیشاب کرنا، یا بکری کا اگلی ٹانگیں اٹھا کر ٹکریں مارنا۔ اور مُرغ کے لیے 'سرڈی کاک' جیسے ناموں سے یاد کرنا قارئین کے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔ جو انوکھا ہونے کے ساتھ ساتھ بہت پُر لطف بھی ہے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اپنے افسانوں اور ناولوں کا مواد اپنے آس پاس کے معاشرے سے حاصل کیا ہے، اس کی ایک اور بہترین مثال "خطوط کی ستم ظریفی" میں ملتی ہے۔ جس میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے صرف اُن خطوط کا ذکر کیا ہے، جو اشتہار "ضرورت رشتہ" کے جواب میں موصول ہوتے ہیں:۔

"رجسٹریوں کا انبار لگ گیا۔ خدا کی پناہ میں کیا عرض کروں کہ
کیسے کیسے خطوط آئے۔ مولویوں سے لے کر بدمعاشوں تک تھے۔
کوئی سو روپیہ کی نوکری پر ہیں تو استعفیٰ دینے کو تیار، کوئی تجارت
پیشہ ہیں تو اسے لات مارنے کو تیار اور پھر ایک سے ایک اعلیٰ
خاندان کے افراد موجود۔ ایسے کہ اگر کہیں میں لڑکی ہوتا تو بیک
وقت مجھے اُن امیدواروں میں سے کئی سے شادی کرنا پڑتی۔
—— پھر اِن خطوط کا لب و لہجہ معاذ اللہ گویا بھیک مانگ رہے
ہوں۔ بغیر کہے سُنے خط غلامی لکھنے کو تیار ہیں، گویا محض لڑکی کے
اعلیٰ خاندان ہونے کی وجہ سے، اس قدر 'اتارو' ہو رہے ہیں
—— پھر تصویریں تو بس دیکھا کیجیے۔ ایک سے باغلبوش اور پرندہ
موجود۔ ایسا کہ اسے دیکھا کیجیے۔ اُن میں اگر خاص خاص خطوط کا
ذکر کیا جائے تو ایک دیوان مرتب ہو جائے۔"

یہ تخیئل پروازی دراصل مرزا چغتائی کے ضرورت سے زیادہ کمزور اور
ناتواں ہونے کے باعث پیدا ہوئی لیکن اس نے اردو ادب کے سرمایہ کو مالا
مال کیا۔ ہوتا یہ تھا کہ وہ کمزور تھے اس لیے وہ بہت کچھ نہیں کر پاتے تھے،
جو اُن کے ہم عمر کر گزرتے تھے اس لیے وہ اپنے خیال میں ایک دنیا آباد کرتے

لہ خطوط کی ستم ظریفی۔ صفحہ۔ 19

تھے اور پھر اسے تخیل سے سجا کر، مزاح کی چاشنی ملا کر اس طرح پیش کرتے تھے کہ بالکل ہی نئی اور پُر لطف چیز ابھر کر سامنے آجاتی تھی۔ "کھرپا بہادر" ایسے ہی دلچسپ اور بہادری کے کارناموں کی ایک بہترین مثال ہے۔ بقول عصمت چغتائی :۔

"کھرپا بہادر۔ جس کا پہلا ٹکڑا "روح لطافت میں چھپا ہے۔ یہ سب تخیل ہے، لاچار مجبور انسان اپنے ہمزاد سے دنیا جہاں کی شرارتیں کروا لیتا ہے۔ وہ خود تو دو قدم نہیں چل سکتا، لیکن ہمزاد چوریاں کرتا ہے، شرارتیں کرتا ہے۔ خود تو ایک انگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا مگر ہمزاد بھی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کا ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا ہی مضبوط ہوتا دوسرے بھائیوں کی طرح۔" [1]

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے جو کچھ لکھا وہ ان کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے اور اسی سے خود اُن کے قول کے مطابق اکثر افسانے واقعات پر مبنی ہوتے ہیں چونکہ شوخ طبع تھے، اس لیے تحریر میں شوخی اور شرارت کا رنگ لازمی طور پر آگیا ہے جس نے معمولی معمولی سے واقعات میں ایسا رنگ بھر دیا کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور پھر بھی طبیعت پر کسی بھی طرح کی گرانی محسوس نہیں

---

[1] چوٹیں۔ صفحہ ۱۸۸

ہوتی ہے بلکہ ہر بار نیا ہی لطف محسوس ہوتا ہے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کا کوئی بھی ناول ہو یا افسانہ ہو اس کے پس پردہ ایک پیغام ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے انھوں نے ہمیشہ اپنے ناولوں یا افسانوں کے ذریعہ معاشرت کی اصلاح کی بھی کوشش کی ہے اور اُن برائیوں اور سماج کی بُری رسموں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش ہے، جن کی وجہ سے سماج میں اور برائیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ وہ خود تعلیم یافتہ تھے، ہر ایک کے لیے اعلیٰ تعلیم کے خواہاں تھے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے خواہاں بھی تھے، لیکن پردے کے سخت مخالف تھے۔ اس لیے انھوں نے دو کتابیں " قرآن اور پردہ " اور " حدیث اور پردہ " میں کھول کر یہ ثابت کر دیا کہ مذہب اسلام نے کبھی سختی سے پردہ کی تاکید نہیں کی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے عورت کو آزاد اور خود مختار دیکھنا چاہتے تھے۔ عورتوں اور لڑکیوں کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام ان کے ہر افسانے اور ناول میں ملے گا۔

" مصری کورٹ شپ "، ایک ایسا ہی دلچسپ افسانہ ہے جس میں انھوں نے حدیثوں کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں اپنی مرضی کے مطابق رشتہ قائم کر سکتے ہیں۔

میں تو یہ کہوں گا کہ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے " قرآن اور پردہ " اور " حدیث اور پردہ "، جیسی حد درجہ مفید کتابیں لکھ کر ہندوستانی مسلمانوں پر ایک

زبردست احسان کیا ہے ـــــ موجودہ نسل ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی اُن کا یہ احسان مانیں گی ـــــ آج دوسری قومیں جو ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اُن کی ترقی کا سبب آزادیٔ نسواں اور تعلیم نسواں ہے۔ ہمیں اُن کے نقش قدم پر چلنا چاہیے ـــــ

مرزا عظیم بیگ چغتائی مولویوں کے بہت خلاف تھے۔ اور خاص طور پر ان مولویوں کے جو نیم حکیم کے درجے میں آتے ہیں۔ علمار کی قدر کرتے تھے۔ اکثر جگہ پر آپ نے اپنے مضامین میں اس قسم کے مولویوں کا مذاق اڑایا ہے یا ان کو دلائل کے ذریعہ قائل کرنے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے میں آج جو بہت سی خرابیاں ہیں، وہ اسی قسم کے نیم حکیم مولویوں کی وجہ سے ہیں کیونکہ مولویوں میں ایک خاص قسم کی ضد ہوتی ہے اور خود ذرا بھی جھکنے کو تیار نہیں ہوتے ہیں۔ چاہتے ہیں دوسرا اُن کی بات مانے چلا جائے۔ دین کی باتوں پر اس قدر زور دیتے ہیں کہ دنیا کو بھول جاتے ہیں۔ نماز پر اس قدر زور دیں گے کہ انسان اپنی ذمہ داری سے گمراہ ہو جائے۔ دنیا میں رہنا ہے تو کچھ فرائض بیوی بچوں۔ ماں باپ اور پڑوسیوں کے بھی ہیں۔ اسی لیے مرزا عظیم بیگ چغتائی مولویوں کے بہت خلاف تھے۔ ناول "چمکی" کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے کہ وہ مولانا سے کس طرح مخاطب ہوتے ہیں :۔

"دوسرے روز مولانا قال اللہ معہ اپنی بہن کے آگئے۔ میں نے ان کا

تام قال اللہ یوں رکھا تھا کہ یہ ضرورت سے زیادہ مولوی واقع ہوئے تھے اور بہت سی قرآنی آیات یاد کرلی تھیں، جن کا دوران گفتگو استعمال کرتے تو کہتے قال اللہ تعالیٰ ـــــ اپنی بہن کی طرح صاحبِ جمال تھے، حُسن میں داڑھی کے ذریعہ اضافہ فرماتے تھے۔ میں نے ان کے آنے سے قبل ہی سوچ لیا تھا کہ مولوی نُما آدمی مولویاً پیچ سے ہارے گا۔" لے

مرزا عظیم بیگ چغتائی کے ناولوں اور افسانوں میں مزاحیہ رنگ بہت نمایاں ہے کیونکہ وہ واقعات سے اپنے افسانوں میں مزاح پیدا کرتے ہیں، اسی لیے کردار نگاری کے تیکھے نقوش وہ نہیں چھوڑ پائے ہیں۔ میری مراد ہے ایسے کرداروں سے جیسے سرشار کا "خوجی" یا میاں آزاد یا کنھیا لال کپور کا برج بانو ـــــ ایسا کوئی لافانی کردار مرزا عظیم بیگ چغتائی تخلیق نہیں کرسکے، ایسے لافانی کردار اپنے خالق کو بھی امر بنا دیتے ہیں اور پھر مصنف اپنے کرداروں کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے۔ ایسا کوئی کردار مرزا عظیم بیگ چغتائی نہیں تراش سکے۔ کیونکہ وہ کردار کو اہمیت دینے کے بجائے واقعات و حادثات پر زور دیتے ہیں اور ان کو آپ بیتی کے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ایک مضمون میں خود فرماتے ہیں:۔

"عموماً افسانے آپ بیتی کے طرز پر لکھتا ہوں۔ افرادِ افسانہ یعنی وہ

لے چمکی۔ صفحہ ۵۵

شخص جن کا میں افسانوں میں ذکر کروں بہت کم ہوں گے یہی سبب ہے کہ میرے ناولوں میں ایک یا دو نام ملیں گے۔" ؎

اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے زیادہ تر افسانے ذاتی، عزیز و اقارب یا دوست احباب کے واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بقول عصمت چغتائی :-

"جب عظیم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم سب ان کے ایکٹنگ کیا کرتے تھے۔ ہم ہلتے جلتے کھلونے تھے اور وہ ایک نقاش، جس نے بالکل اصلی کی نقل کر دی۔ جتنی دفعہ "خانم" کو پڑھتی ہوں یہی معلوم ہوتا ہے خاندان کا گروپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھابی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں۔ وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کر رہے ہیں اور مصنف خود سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہے۔ ؎

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں واقعات کے بیان میں اس قدر جلد بازی سے کام لیا کہ زبان و بیان پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔ بس کوشش یہ کی کہ وہ قاری تک جلد از جلد وہ سب کچھ پہنچا دیں جو انھوں نے سوچا ہے اور مزاح کا لطف ختم نہ ہونے پائے۔ اس لیے سارا زور قصہ کے بیان پر دیا کیونکہ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا خیال ہے :-

" بعد میں دوستی کر کے زبان ٹھیک ہو سکتی ہے۔ مگر جو افسانہ دیر تک

؎ مضامین چغتائی۔ صفحہ - 48

قبضہ میں نہیں رہتا، اس میں زبان کی غلطیاں رہ جاتی ہیں"[1]

مگر مرزا چغتائی یہ کہتے ہی رہے اور اپنے افسانوں کی زبان و بیان کی خامیاں درست نہیں کیں۔ افسانے برجستہ لکھے اور ناشر حضرات کو روانہ کر دیے۔ یہی وجہ ہے کہ برجستہ تحریر کا تو لطف ان کے افسانوں میں ملتا ہے لیکن اکثر جگہ وہ روانی میں زبان اور محاوروں کا خیال نہیں رکھ پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ جملوں کی ترتیب بھی بگڑ گئی ہے۔ بقول عصمت چغتائی:۔

"اُن کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں۔ فضول سی خصوصاً "کولتار" تو بالکل ردّی ہے۔ مگر اس میں بھی حقیقت کو اصلی صورت میں گڑبڑ کرکے لکھ دیا ہے۔ شریر بیوی بالکل فضول ہے۔ مگر اپنے زمانے کی بڑی چلتی ہوئی چیز تھی۔ "چمکی"، ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے۔" [2]

جنس ہمارے ادب کا، ہماری زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے۔ اس کے بغیر جیسے کمی کا احساس ہوتا ہے اور اسی لیے ہر ایک افسانہ نویس اور ناول نگار کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں جنسی جذبات کی عکاسی یا ذکر ضرور مل جاتا ہے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی بھی جنسی جذبات کی عکاسی سے اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں ——— "چمکی"، اس موضوع پر ایک بہترین ناول ہے جو ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے طرز تحریر کا کمال یہ ہے کہ ان کے

---

[1] مضامین چغتائی۔ صفحہ۔ 48 [2] چوٹیں۔ صفحہ۔ 153

کسی بھی ناول میں جسم کی عریانیت کہیں نہیں ملے گی، انھوں نے جسم کے بجائے جذبات کی عریانیت سے زیادہ کام لیا ہے ۔۔ یعنی جذبات کو عریاں کر کے پیش کیا ہے اور بلا تکلف جوں کے توں بیان کر دیے ہیں ۔۔۔ یہ انداز صرف "چمکی" میں ہی نہیں اختیار کیا ہے بلکہ اُن کے ہر افسانے میں تقریبًا یہی انداز ہے یعنی انھوں نے کہیں بھی اپنی ہیروئن کو ننگا نہیں کیا ہے۔ وہ اسے کپڑوں میں دیکھنا پسند کرتے ہیں یعنی حسن کو دیکھتے ہیں، جسم کو نہیں۔

"اس نے چھوٹی بی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا اور آہستہ سے دروازہ بند کر دیا اور پھر ایک دل رُبا انداز سے تصویر جوانی بنی، مسکرائی، آنکھیں مخمور اور جھپکاتی ہوئی اس طرح سے آگے بڑھی کر مجھے بے تاب کر دیا۔ اس کی آہستہ روی نے غضب ڈھا دیا۔ بے تاب ہو کر میں نے اپنے آغوش میں لینے کو اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور وہ جھپٹ کر میرے سینے سے آ لگی"۔ [1]

الغرض مرزا عظیم بیگ چغتائی اپنے تمام ہم عصر مزاح نگاروں سے اس لیے قدرے مختلف نظر آتے ہیں کہ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں مکالموں کے ذریعہ طنز کے نشتر برسانے کے ساتھ ساتھ، ایسے پلاٹ کا بھی انتخاب کیا ہے، جو ہنسانے والے ہوتے ہیں اور اسی لیے جب تک آپ مکمل ناول نہ پڑھ لیں آپ

---

[1] چمکی۔ صفحہ۔ ۱۷۷

اس سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ بعض جگہ انھوں نے ایسے واقعات کو قلم بند کیا ہے، جن پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے مگر ان کے کہنے یا بیان کرنے کا انداز اس قدر دلچسپ ہے کہ وہ بات گراں نہیں گزرتی ہے بلکہ دلکش معلوم ہوتی ہے اور یہی دلکشی مرزا عظیم بیگ چغتائی کے فن کا کمال ہے۔ دراصل یہی اُن کا فن یا آرٹ ہے ـــــ محترمہ مس حجاب اسمٰعیل نے کیا خوب بات کہی ہے:۔

"جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی صاحب کے افسانوں کی اصل خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ شادی شدہ گھر میں ایک ایسی فضا قائم کر دکھاتے ہیں جو صرف خیالی اور رومانٹک ہی نہیں سمجھی جا سکتی بلکہ ذرا سی کوشش، ذرا سی توجہ سے ہر بیاہے گھر میں پیدا کی جا سکتی ہے۔" [1]

یہی ہے وہ اصل فن جو صرف مرزا عظیم بیگ چغتائی کے حصہ میں آیا تھا، جو دوسرے فنکاروں کو نصیب نہیں ہوا۔ اور آج بھی مرزا عظیم بیگ چغتائی جو لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں، اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے وہ فطری ہوتا تھا۔ حقیقت سے بہت قریب۔ دیکھا بھالا۔ اس لیے اجنبیت کا احساس کبھی ان کے افسانوں یا ناولوں میں محسوس نہیں ہوا۔ اس لیے ادب نواز طبقہ نے ان کو مصور ظرافت ہے کہا ہے۔

---

[1] خانم۔ صفحہ۔ ۱۱

مرزا عظیم بیگ چغتائی

کے بارے میں

اساتذہ اور ناقدین کی آراء

کسی بھی مصنف کے بارے میں رائے دینا یا کچھ کہنا خاصہ مشکل کام ہے کوئی بھی رائے اس وقت تک وقیع اور قابل قبول نہیں ہوتی ہے جب تک کہ سنجیدگی سے مطالعے کے بعد نہ دی گئی ہو —— اس لیے ضروری ہے کہ جب تک کسی مصنف کے بارے میں کچھ کہا جائے تو پہلے اس کی تصانیف کا مطالعہ کر لیا جائے۔ ایسی آرا ہی قدر و منزلت رکھتی ہیں اور ان سے دوسرے حضرات کو بھی اپنی رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ میں نے یہاں جو چند آرا کو یکجا کیا ہے، وہ تمام کی تمام وہ ہیں جو بڑے بڑے ناقدین حضرات نے مرزا عظیم بیگ چغتائی کی تصانیف کے عمیق مطالعے کے بعد دی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ آرا آپ کو مرزا عظیم بیگ چغتائی کے فن کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

عصمت چغتائی:

"وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور، ٹانگیں عرصے اکڑی ہوئی،

یا ہیں انجکشنوں سے گدی ہوئی، کولھے میں امرود برابر پھوڑا، آخری دم
میں چیونٹیاں جسم میں لگنا شروع ہوگئیں کیا ہنس کر کہتا ہے چیونٹی
صاحبہ بھی کس قدر بے صبر ہیں یعنی قبل از وقت اپنا حصہ لینے آن
پہنچیں..... یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا —— دل چاہیے پتھر کا
کلیجہ ہو مرتے وقت جملے کسنے کے لیے۔

ان کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے، ایک لفظ ہو جو 81 آئے، پوری
کی پوری کتابیں ایسے ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں —— دماغ تھا کہ
انجن۔ بنا آگ پانی ہر وقت چلتا رہتا تھا اور زبان تھی کہ قینچی، اس قدر
نپے تلے جملے نکالتی تھی کہ جم کر رہ جاتے تھے۔" (چوٹیں صفحہ 151)

عصمت چغتائی صاحبہ جو مرزا عظیم بیگ چغتائی کی چھوٹی بہن ہیں، اپنے بھائی پر بڑا ہی بے لاگ مضمون لکھا ہے "دوزخی"، جس کے دو اقتباسات میں پہلے ہی نقل کر چکا ہوں۔ لیکن تیسرا اقتباس نقل کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ عصمت چغتائی کا تعلق ترقی پسندوں سے تھا، اس لیے ان کے سوچنے اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کے سوچنے میں خاصہ فرق تھا۔ اس فرق کو مدِ نظر رکھیے، ساتھ ساتھ عمر کو بھی تو پھر آپ کو اور زیادہ لطف آئے گا اس پیراگراف کے مطالعے میں اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کے خیالات کو سمجھنے میں آپ کو اور زیادہ مدد ملے گی۔

"عظیم بھائی" کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں یعنی بالکل نئے ادب میں نہ تھی کہ وہ کھلی باتیں نہ لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے۔ مگر اس کا جسم بہت کم دیکھتے تھے۔ جسم کی بناوٹ کی داستانیں پرانی مثنویوں، گل بکاؤلی زہر عشق میں بہت نمایاں تھیں اور پھر انھیں پرانی کہہ دیا گیا۔ لیکن اب یہ فیشن نکلا ہے کہ وہی پرانا سینہ کا اتار چڑھاؤ پنڈلیوں کی گاؤ دمی، زانوؤں کا گداز نیا ادب بن گیا ہے۔ وہ اِسے عُریانی سمجھتے تھے اور عریانی سے ڈرتے تھے، گو جذبات کی عریانی ان کے یہاں عام ہے اور وہ بہت غلیظ باتیں لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ وہ عورت کے جذبات تو عریاں دیکھتے تھے، مگر خود اسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے۔ وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اور بچہ سمجھتے تھے۔ کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے۔ ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں لیکن بھوکے ہیں اور اوپر سے ان پر جنسی اثر بہت ہے، جو کچھ لکھتے ہیں اماں کھانا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہندوستانی ادب میں، ہر زمانے میں جنس بہت نمایاں رہی ہے۔ یہاں کے لوگ جنس سے بہت متاثر ہیں۔ ہماری شاعری مصوری، قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے اور اگر

ذرا دیر عشق و محبت کو بھول جائیں تو مقبول عام نہیں رہ سکتے۔"

(چوٹیں۔صفحہ 152 اور 153)

مس حجاب اسماعیل :

" مرزا عظیم بیگ چغتائی کی کہانیوں کی خوبی، ان کی جدّت ہے یعنی وہ افسانہ نویسی نہیں بلکہ اس کی بجائے "وقائع نگاری" کو قائم کرنا چاہتے ہیں اور کسی مشہور مصنف کے اس مقولے کو انھوں نے اپنی قصّہ نویسی کا اصول بنا لیا ہے۔" کہ جو دیکھو وہ لکھو"، یعنی پڑھنے والے کو افسانے پر افسانے کا گمان نہ ہو بلکہ وہ یہ سمجھے کہ وہ کسی کی زندگی کے صحیح واقعات کہانی کے پیرائے میں پڑھ رہا ہے۔ اصل نے نقل کہیں زیادہ بہتر ہے۔ جگ بیتی سے آپ بیتی دلچسپ ہوتی ہے"

(خانم۔ دیباچہ۔صفحہ۔14)

ظفر قریشی صاحب :

" مرزا صاحب کی ظرافت کھینچ تان کی ظرافت یا محض لفظوں کے جوڑ توڑ کی ظرافت نہیں ہے، بلکہ زندہ کرداروں کی اصلی و حقیقی زندگی کے دکھاہیہ مناظر ہوتے ہیں۔ جو پڑھنے والے ذہنوں پر ایسا نقش چھوڑ جاتے ہیں کہ اُن کا خیال کرنے پر گھنٹوں ہنسی آتی ہے۔"

(دیباچہ خطوط کی ستم ظریفی۔صفحہ۔ 3)

سید وقار عظیم:

"عظیم بیگ چغتائی کے افسانے اخلاق اور عمل کی اصلاح کے جذبے سے خالی نہیں ہیں۔ حقیقت میں ان کے ہر واقعہ اور کردار کے پیچھے کوئی نہ کوئی اصلاحی مقصد شامل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ رنج و غم کا تذکرہ کر کے دوسروں کو رُلا کر یا واعظ اور ناصح کی طرح سننے والوں کو خطابت کے جوش سے متاثر کر کے اصلاحی مقصد کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اُن کے پاس خطابت اور شاعری سے زیادہ دلکش اور پُر تاثیر جذبہ اُن کی ظرافت ہے۔"

(ہمارے افسانے۔ صفحہ۔ 186)

ڈاکٹر وزیر آغا:۔

"مرزا عظیم بیگ چغتائی نے عملی مذاق سے مزاح پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اُن کی دنیا میں محبت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور یہ محبت عملی مذاق کے محور پر گھومتی ہے۔ کولتار۔ شریر بیوی وغیرہ تصانیف میں یکے بعد دیگرے شرارتیں ہی شرارتیں نظر آتی ہیں، جو کالج کے نوخیز لڑکوں کو بہت مرغوب ہیں۔ شاید اسی لیے مرزا عظیم بیگ چغتائی سوسائٹی کے ایک خاص طبقے میں زیادہ مقبول ہیں۔"

(اردو ادب میں طنز و مزاح، صفحہ۔ 220)

پروفیسر وقار عظیم :-

"یہ شرارتیں"۔ جہاں ایک طرف شرارتیں اور ایک مقبول ظرافت نگاری اور جدّت طبع کے شواہد ہیں۔ دوسری طرف اِن میں سے ہر ایک کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد بھی ہے۔ یہ شرارتیں انسان کو اس کی کمزوریوں اور غفلتوں سے آگاہ کر کے اُسے زیادہ ہوشیار اور چاق و چوبند بنانا چاہتی ہے اور اس سے بھی آگے چل کر اس کی نظر سماجی کمزوریوں پر پڑتی ہے تو وہ محض مذاق ہی مذاق میں اُن کمزوریوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتی ہے۔"

(الحمرا۔ نومبر 1952ء)

فضل حق قریشی :-

"چغتائی صاحب کو ادب نواز طبقہ نے "مصوّرِ ظرافت"، کا خطاب دیا تو کچھ زیادہ کمال نہیں کیا۔ کیونکہ حقیقتاً وہ اس کے مستحق تھے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ان کی نگارشات صرف ظرافت کے دائرے ہی تک محدود ہیں عمیق نہیں بلکہ محض سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ظرافت سے بالکل متضاد المیہ رومان لکھنے کے بھی ماہر ہیں۔ کہیں یہ دونوں علیحدہ علیحدہ نظر آئیں گے۔ مثلاً۔ ویمپائر یا ہماری کا خواب"

(ساقی۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی نمبر۔ صفحہ۔ 177)

شاہد احمد دہلوی :-

" جنوری 1930ء میں اُن کا افسانہ " انگوٹھی کی مصیبت" نیرنگِ خیال کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ اس افسانے کے چھپتے ہی ہمارے ادبی حلقوں میں ایک بھونچال سا آگیا۔ جس کو دیکھو اس کی زبان پر اسی کا ذکر۔ بعد میں چغتائی صاحب نے وہ بے شمار خطوط مجھے دکھائے جو اس افسانے کے بارے میں ان کے پاس آئے تھے ــــــــــــ

اس افسانے کے بعد چغتائی صاحب کے چند اور افسانے دوسرے رسالوں میں چھپے مگر وہ اس طرز کے نہیں تھے۔ اس سال اس سے بہتر اور کوئی افسانہ چھپا ہی نہیں۔ حالانکہ اس زمانے میں بڑے بڑے افسانہ نگار تقریباً سب ہی زندہ تھے اور لکھ رہے تھے۔ اس کے کوئی ایک سال بعد میرے پاس علی گڑھ سے خط آیا۔ اس میں چغتائی صاحب کا خط اور دو افسانے تھے۔ خط میں بڑا اخلوص تھا اور کسرِ نفسی بھی۔ ساقی دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔ ان کا خط پاکر بے حد خوشی ہوئی اور اسی دن سے اُن سے ملنے کو جی چاہنے لگا۔ یہ افسانے تھے "ٹکٹ چیکر" اور "کولتار" دوسرا افسانہ بہت مشہور ہوا اور جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو ہم نے منصوبہ بنایا کہ "کولتار" کا پورا ناول کیسے مرتب کیا جائے۔"

(نقوش۔ شخصیات نمبر۔ صفحہ۔ 122 - 123)

پروفیسر وقار عظیم :-

"اس دور کے افسانہ نگاروں میں عظیم بیگ کی شخصیت سب سے منفرد ہے۔ اس لحاظ سے کہ انھوں نے مختصر افسانوں میں سب سے پہلے مزاح کو معاشرتی اور اصلاحی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ لیکن وہ اس نقطۂ نظر سے اپنے پیش رووں کے مقلد ہیں کہ وہ صرف اس زندگی کے متعلق افسانے لکھتے ہیں، جس سے وہ اچھی طرح واقف ہیں اور افسانے لکھتے وقت اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ اصلاح کا مقصد پورا کر کے بھی افسانہ افسانوی دلکشی سے خالی نہ ہو جائے۔"

(داستان سے افسانے تک۔ صفحہ۔ 185)

پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین :-

" طالب علمی کی شرارتیں ان کے افسانے کے ہر فرد میں پائی جاتی ہیں۔ شادی۔ بیاہ نکاح۔ طلاق۔ پردہ وغیرہ کے متعلق وہ موجودہ صورتوں میں بھی کچھ اصلاح چاہتے ہیں۔ ان کے بہت سے افسانوں کی بنیاد ان ہی خیالات پر ہے۔ "قرآن اور پردہ" جیسی سنجیدہ کتابیں لکھ کر اپنے مقصد کو واضح کیا ہے، لیکن ان کی شہرت شریر بیوی، کولتار قائم ہے ——— اردو کے اور مزاح نگار اپنے مکالموں اور طنز سے مزاح پیدا کرتے ہیں لیکن چغتائی صاحب کا پلاٹ ہی ہنسی بننے پر

مجبور کر دیتا ہے۔

(اردو ادب کی تاریخ۔ صفحہ۔ 364)

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی رائے اپنے افسانوں کے بارے میں :۔

" مجھے کچھ اپنے طرز تحریر اور زبان کے بارے میں بھی کہنا ہے۔ میرے تمام افسانے اوریجنل ہیں۔ واقعات سے پُر۔ الحمدللہ میرے تمام افسانوں کے ہیرو بقید حیات ہیں۔ تمام تر افسانوں کے پلاٹ میں نے واقعات اور اپنی معاشرت سے لیے ہیں اور کسی افسانے میں افسوس کر مشہور یوروپین یا امریکن افسانہ سے کچھ نہیں لے سکا "

(روح ظرافت۔ صفحہ۔ 4)

انگوٹھی کی مصیبت

میں نے شاہدہ سے کہا۔" تو میں جا کے اب کنجیاں لے آؤں۔"
شاہدہ نے کہا۔" آخر تو کیوں اپنی شادی کے لیے اتنی تڑپ رہی ہے؟
اچھا جا۔"

میں ہنستی ہوئی چلی گئی۔ کمرہ سے باہر نکلی۔ دوپہر کا وقت تھا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اما جان اپنے کمرہ میں سو رہی تھیں اور ایک خادمہ پنکھا جھل رہی تھی۔ میں چپکے سے برابر والے کمرہ میں پہنچی اور مسہری کے تکیہ کے نیچے سے کنجی کا گچھا لیا۔ سیدھی کمرہ پر واپس آئی۔ اور شاہدہ سے کہا۔" جلدی چلو۔"

ہم دونوں نے چپکے سے پنجوں کے بل چلتے ہوئے کہ کہیں کوئی پیر کی آہٹ نہ سن لے زینہ کی راہ لی، اوپر پہنچی اور ابّا جان والی چھت پر داخل ہوئی۔ وہاں بھی حسبِ توقع سناٹا پایا۔ سب سے پہلے دوڑ کر میں نے دروازہ بند کر دیا جو باہر زینہ سے آنے جانے کے لیے تھا۔ اس کے بعد یہ دروازہ بھی بند کر دیا جس سے ہم دونوں داخل ہوئے تھے۔ سیدھی ابّا جان کے کمرہ میں پہنچ کر الماری کا تالا کھولا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ سامنے بیچ کے تختہ پر تمام خطوط اور تصویریں رکھی ہیں۔

"وہ دیکھ! وہ دیکھ وہ اچھا ہے"، شاہدہ نے کہا۔

"نہیں شروع سے دیکھو...... اِدھر سے" یہ کہہ کر میں نے شروع کا بنڈل کھولا اور اس میں سے تصویر نکالی۔ یہ ایک پروفیسر صاحب کی تصویر تھی۔ جن کی عمر کوئی پینتیس سال کی ہوگی۔ یہ نہایت ہی عمدہ سوٹ پہنے بڑی شان سے کرسی کا تکیہ پکڑے کھڑے تھے۔ کرسی پر ان کا پانچ سال کا بچّہ بیٹھا تھا۔ ان کی پہلی بیوی مر چکی تھیں۔ اور اب مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ نام اور پتہ وغیرہ سب تصویر کی پشت پر موجود تھا۔

"یہ لے! شاہدہ نے کہا" پہلی ہی بسم اللہ غلط!"

میں نے تصویر دیکھتے ہوئے کہا "کیوں؟ کیا بُرا ہے؟"

"کمبخت یہ دوہا جو ہے، اس سے بھُول کے بھی مت کیجیو۔ تو تو اپنی طرح کوئی کنوارا ڈھونڈ۔ اری ذرا اس لونڈے کو دیکھ! اگر نہ تیرا یہ ناک میں دم کر دے اور نتھنوں میں تیر ڈال ڈال دے۔ تو میرا نام پلٹ کر رکھ دیجیو۔ دیکھتی نہیں کہ بس کی گانٹھ کتنا شریر ہے۔ اور پھر راتوں کو تیری سَوت خواب میں الگ آ کر تیرا گلا دبائے گی"

"تُو تو پاگل ہو گئی ہے"، میں نے کہا" شاہدہ ڈھنگ کی باتیں کر"

شاہدہ ہنستے ہوئے بولی " میری بلا سے۔ کل کی کرتی تو آج کر لے۔ میری دانست میں تو اس پروفیسر کو بھی کوئی ایسی ہی ملے تو ٹھیک رہے۔ جو تین موذی بچّے

جہیز میں لائے اور وہ اس کے چھوکرے کو مارتے مارتے اُتو کر دیں۔ چل رکھ اس کو ...... دوسری دیکھ ...... !"

پہلی تصویر پر یہ ریمارک پاس کیا گیا اور اس کو جوں کا توں رکھ کر دوسری تصویر لی اور شاہدہ سے پوچھا: "یہ کیسا ہے؟"

شاہدہ غور سے دیکھ کر بولی: "ویسے تو ٹھیک ہے۔ مگر ذرا کالا ہے۔ کون سے درجے میں پڑھتا ہے۔؟"

میں نے تصویر کو دیکھ بھال کر کہا: "بی۔ اے میں پڑھتا ہے۔ کالا تو ایسا نہیں ہے۔"

شاہدہ نے کہا: "ہوں! یہ آخر تجھے کیا ہو گیا ہے۔ جسے دیکھتی ہے اس پہ عاشق ہو جاتی ہے۔ نہ کالا دیکھتی ہے نہ گورا۔ نہ بڈھا دیکھتی ہے نہ جوان!"

میں نے زور سے شاہدہ کے چٹکی لے کر کہا: "کمبخت میں نے تجھے اس لیے بلایا تھا کہ تو مجھے تنگ کرے؟ غور سے دیکھ۔"

غور سے تصویر کو دیکھ کر اور کچھ سوچ کر شاہدہ بولی: "نہ بہن یہ ہرگز ٹھیک نہیں۔ میں تو کہہ چکی ہوں، آئندہ تو جانے۔"

میں نے کہا: "خط تو دیکھ بڑا رئیس کا لڑکا ہے۔" یہ تصویر ایک طالب علم کی تھی جو ٹینس کا بلّا لیے ہوئے بیٹھا تھا۔ دو تین تمغے لگائے ہوئے تھا اور دو تین جیتے ہوئے کپ سامنے میز پر رکھے ہوئے تھے۔

شاہدہ بولی: "ویسے تو لڑکا بڑا اچھا ہے۔ عمر میں تیرے جوڑ کا ہے مگر ابھی پڑھتا ہے۔"

اور تیرا بھی شوکت کا سا حال ہو گا کہ دس روپے ماہوار جیب خرچ اور کھانے اور کپڑے پر نوکر ہو جائے گی اور دن رات ساس نندوں کی جوتیاں، یہ تو جھگڑا ہے۔"

میں نے کہا "بی۔اے میں پڑھتا ہے۔ سال دو سال میں نوکر ہو جائے گا۔"

ٹینس کا جمعدار ہو رہا ہے۔ تو دیکھ لیجیو دو تین دفعہ فیل ہو گا اور ساس نندیں بھی کہیں گی کہ بیوی پڑھنے نہیں دیتی۔ اور وہ پھر دوڑنے دھوپنے کا شوقین، تجھے ریٹا مارے گا، ویسے تو لڑکا اچھا ہے، صورت بھی بھولی بھالی ہے۔ اور ایسا ہے کہ جب شرارت کرے اٹھا کر طاق پہ بٹھا دیا۔ مگر نہ بابا میں رائے نہ دوں گی۔"

اس تصویر کو بھی رکھ دیا اور اب دوسرا بنڈل کھولا اور ایک تصویر نکلی۔

" اخاہ! یہ مُوا پان کا غلام کہاں سے آیا"، شاہدہ نے ہنس کر کہا۔ "دیکھ تو کمبخت کی داڑھی کیسی ہے۔ اور پھر مونچھیں اس نے ایسی کترائی ہیں کہ جیسے سینگ کٹا کر بچھڑوں میں مل جائے!"

میں بھی ہنسنے لگی۔ یہ ایک بڑے معزز رئیس اور آنریری مجسٹریٹ تھے اور ان کی عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ مگر مجھ کو ذرہ بھر پسند نہ آئے۔

غور سے شاہدہ نے تصویر دیکھ کر پہلے تو ان کی نقل بنائی اور پھر کہنے لگی:۔

" ایسے کو بھلا کون لڑکی دے گا؟ نہ معلوم اس کے کتنی لڑکیاں اور بیویاں ہوں گی۔ پھینک اِسے۔"

یہ تصویر بھی رکھ دی گئی۔ اور دوسرا بنڈل کھول کر ایک اور تصویر لی۔

"یہ تو گبرو جوان ہے! اس سے تو فوراً کر لے"، شاہدہ تصویر دیکھ کر بولی۔

"یہ ہے کون؟ ذرا دیکھ۔"

میں نے دیکھ کر بتایا کہ ڈاکٹر ہے۔

بس بس۔ یہ ٹھیک ہے۔ خوب تیری نبض ٹٹول ٹٹول کے روز تھرمامیٹر لگائے گا۔ صورت شکل بھی ٹھیک ہے۔" شاہدہ نے ہنس کر کہا۔" میرا میاں بھی ایسا ہی ہٹا کٹا، موٹا تازہ ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔" کمبخت آخر تو ایسی باتیں کہاں سے سیکھ آئی ہے۔ کیا کیا تو نے اپنے میاں کو دیکھا ہے۔؟"

"دیکھا تو نہیں مگر سنا ہے کہ بہت اچھا ہے۔"

"بھدلسیلا سا ہوگا۔" شاہدہ نے چیں بچیں ہو کر کہا" اتنا تو میں جانتی ہوں کہ جو کہیں تو اسے دیکھ لے تو شاید لٹو ہی ہو جائے۔"

میں نے اب ڈاکٹر صاحب کی تصویر کو غور سے دیکھا اور نکتہ چینی شروع کی۔ نہ اس لیے کہ مجھے یہ ناپسند تھے۔ بلکہ محض اس لیے کہ خوب رائے زنی ہو سکے۔ چنانچہ میں نے کہا" ان کی ناک ذرا موٹی ہے۔"

"سب ٹھیک ہے۔" شاہدہ نے کہا۔" ذرا اس کا خط تو دیکھ۔"

میں نے دیکھا کہ صرف دو خط ہیں۔ پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ان کی پہلی بیوی موجود ہیں مگر پاگل ہو گئی ہیں۔

"پھینک پھینک اسے کمبخت کو پھینک" شاہدہ نے جل کر کہا۔ جھوٹا ہے کمبخت کل کو تجھے بھی پاگل خانہ میں ڈال کے تیسری کو تکے گا۔"

ڈاکٹر صاحب بھی نامنظور کر دیے گیے اور پھر ایک اور تصویر اٹھائی۔

شاہدہ نے اور میں نے غور سے اس تصویر کو دیکھا۔ یہ تصویر ایک نوعمر اور خوب صورت جوان کی تھی۔ شاہدہ نے پسند کرتے ہوئے کہا۔"یہ تو ایسا ہے کہ میری بھی رال ٹپکی پڑ رہی ہے۔ دیکھ تو کتنا خوبصورت جوان ہے۔ بس اس سے آنکھ میچ کے کر لے اور اسے گلے کا ہار بنا لیجیؤ۔"

ہم دونوں نے غور سے اس تصویر کو دیکھا۔ ہر طرح دونوں نے پسند کیا اور پاس کر دیا۔ شاہدہ نے اس کے خط کو دیکھنے کو کہا۔ خط جو پڑھے تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت ولایت میں پڑھتے ہیں۔

"ارے توبہ توبہ۔ چھوڑ اسے" شاہدہ نے کہا۔

میں نے کہا "کیوں، آخر کوئی وجہ؟"

"وجہ یہ کہ بھلا اِسے وہاں کی مِسیں چھوڑیں گی۔ عجب نہیں کہ ایک آدھ کو ساتھ لے آئے۔"

میں نے کہا۔" واہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ احمد بھائی کو تو دیکھو، پانچ سال ولایت میں رہے تو کیا ہو گیا۔"

شاہدہ تیزی سے بولی۔" بڑے احمد بھائی احمد بھائی، رجسٹر لے کر وہاں کی

بھاوجوں کے نام لکھنا شروع کرے گی تو عمر ختم ہو جائے گی اور رجسٹر تیار نہ ہوگا۔ میں تو ایسا جوا نہ کھیلوں اور نہ کسی کو صلاح دوں۔ یہ اُدھار کا سا معاملہ ٹھیک نہیں۔"

یہ تصویر بھی ناپسند کر کے رکھ دی گئی اور اس کے بعد ایک اور نکالی۔ شاہدہ نے تصویر دیکھ کر کہا۔" یہ تو اللہ رکھے اس قدر باریک ہیں کہ سوئی کے ناکے میں سے نکل جائیں گے۔ علاوہ اس کے کوئی آندھی بگولا آیا تو یہ اُڑ اُڑا جائیں گے۔ اور تو رانڈ ہو جائے گی۔"

اسی طرح دو تین تصویریں اور دیکھی گئیں کہ اصل تصویر آئی اور میرے منہ سے نکل گیا۔" اخاہ۔"

" مجھے دے۔ دیکھوں۔ دیکھوں۔" کہہ کر شاہدہ نے تصویر لے لی۔

ہم دونوں نے غور سے اس کو دیکھا۔ یہ ایک بڑی سی تصویر تھی۔ وہ خود ہی تصویر تھا اور پھر اس قدر صاف اور عمدہ کھینچی ہوئی کہ بال بال کا عکس موجود تھا۔ شاہدہ نے ہنس کر کہا۔" اسے مت چھوڑیو۔ ایسے ملیں تو میں دو کر لوں۔ یہ آخر ہے کون؟"

تصویر کو الٹ کر دیکھا۔ جیسے دستخط اُوپر تھے ویسے ہی پشت پر تھے۔ مگر شہر کا نام لکھا ہوا تھا اور بغیر خطوط کو دیکھے ہوئے مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ کس کی تصویر ہے۔ میں نے شاہدہ سے کہا۔" یہ وہی ہے جس کا میں نے تجھ سے اس روز ذکر کیا تھا۔"

"اچھا یہ بیرسٹر صاحب ہیں"۔ شاہدہ نے پسندیدگی کے لہجہ میں کہا۔ صورت شکل تو خوب ہے۔ مگر ان کی کچھ چلتی بھی ہے کہ نہیں؟"

میں نے کہا۔" ابھی کیا چلتی ہو گی۔ ابھی آئے ہی کتنے دن ہوئے ہیں۔"

"تو پھر ہوا کھاتے ہوں گے۔" شاہدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔" خیر تو اس سے ضرور کرلے خوب تجھے موٹروں پر سیر کرائے گا۔ سینما اور تھیٹر دکھائے گا اور جلسوں میں نچائے گا۔"

میں نے کہا" یہ کچھ غریب تھوڑے ہی ہیں۔ ابھی تو باپ کے سر کھاتے ہیں۔"

شاہدہ نے چونک کر کہا۔" اری بات تو سُن!"

میں نے کہا۔" کیوں۔"

شاہدہ بولی۔" صورت شکل بھی اچھی ہے۔ خوب گورا چٹا ہے۔ بلکہ تجھ سے بھی اچھا ہے۔ اور عمر بھی ٹھیک ہے مگر یہ تو بتا کہ کہیں کوئی میم ویم تو نہیں پکڑ لایا ہے۔"

میں نے کہا۔" مجھے کیا معلوم۔ لیکن اگر کوئی ساتھ ہوتی تو پھر شادی کیوں کرتے۔"

"ٹھیک ٹھیک۔" شاہدہ نے سر ہلا کر کہا۔" بس تو اللہ کا نام لے کر پھانس۔"

میں نے خط اٹھائے اور شاہدہ دوسری تصویریں دیکھنے لگی۔ میں خط پڑھ رہی تھی اور وہ ایک تصویر کو منہ چڑا رہی تھی۔ میں نے خوش ہو کر اس کو چپکے چپکے خط کا کچھ حصہ سُنایا۔ شاہدہ سُن کر بولی۔" اِلّا اللہ۔" میں نے اور آگے پڑھا تو کہنے لگی "وہ مارا۔" غرض سب خط کا مضمون سُنایا۔

شاہدہ نے خط سُن کر کہا۔" یہ تو سب معاملہ فٹ ہے اور چُول بیٹھ گئی ہے۔ اب تو گڑ تقسیم کر دے۔"

پھر ہم دونوں نے اس تصویر کو غور سے دیکھا۔ دونوں نے رہ رہ کر بے حد پسند کیا۔ یہ ایک نوعمر بیرسٹر تھے اور غیر معمولی طور پر خوبصورت معلوم ہوتے تھے اور ناک نقشہ سب بے عیب تھا۔ شاہدہ رہ رہ کر تعریف کر رہی تھی۔ داڑھی مونچھیں سب صاف تھیں اور ایک دھاری دار سُوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں کوئی ساب تھی۔

میں نے بیرسٹر صاحب کے دوسرے خط بھی پڑھے۔ اور مجھ کو کل حالات معلوم ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ بیرسٹر صاحب بڑے اچھے اور رئیس گھرانے کے ہیں۔ شادی کا معاملہ طے ہو گیا ہے۔ آخری خط سے پتہ چلتا تھا کہ صرف شادی کی تاریخ کے معاملہ میں کچھ تصفیہ ہونا باقی ہے۔

میں نے چاہا کہ اور دوسرے خط پڑھوں اور خصوصاً آنریری مجسٹریٹ صاحب کا۔ مگر شاہدہ نے کہا۔" اب دوسرے خط نہ پڑھنے دوں گی۔ بس یہی ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا۔" ان کے ذکر کی بھنک ایک مرتبہ سُن چکی ہوں۔ آخر دیکھ تو لینے دے کہ معاملات کہاں تک پہنچ چکے ہیں۔"

شاہدہ نے جھٹک کر کہا۔" چل رہنے دے اس موذی کا ذکر تک نہ کر۔"

میں نے بہت کچھ کوشش کی مگر اس نے ایک نہ سُنی۔ قصہ مختصر جلد ی جلدی سب چیزیں جوں کی توں رکھدیں۔ اور الماری بند کر کے میں مردانہ زینہ کا

دروازہ کھولا۔ اور شاہدہ کے ساتھ چپکے سے جیسے آئی تھی ویسے ہی کمرہ پر واپس آئی۔ جہاں سے کنجی لی تھی اسی طرح رکھ دی۔ شاہدہ سے دیر تک بیرسٹر صاحب کی باتیں ہوتی رہیں۔ شاہدہ کو میں نے اسی لیے بلایا تھا۔ شام کو وہ اپنے گھر چلی گئی۔ مگر اتنا کہتی گئی کہ "خالہ جان کی باتوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ تیری شادی اب بالکل طے ہو گئی ہے اور تو بہت جلد لٹکائی جائے گی۔"

(2)

اس بات کو مہینہ بھر سے زاید گزر چکا تھا۔ کبھی تو ابا جان اور اماں جان کی باتیں چپکے سے سن کر اُن کے دل کا حال معلوم کرتی تھی اور کبھی اوپر جاکر الماری سے نئے خطوط نکال کر پڑھتی تھی۔

میں دل ہی دل میں خوش تھی کہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت بھلا کون ہو گی کہ بدقسمتی سے معلوم ہوا کہ معاملہ طے ہو کر بگڑ رہا ہے۔

آخری خط سے معلوم ہوا کہ بیرسٹر صاحب کے والد صاحب چاہتے ہیں کہ بس فوراً ہی نکاح اور رخصتی سب ہو جائے اور اماں جان کہتی تھیں کہ میں پہلے صرف نسبت کی رسم ادا کروں گی۔ اور پھر پورے سال بھر بعد نکاح اور رخصتی کروں گی۔ کیونکہ میرا جہیز وغیرہ کہتی تھیں کہ اطمینان سے تیار کرنا ہے۔ اور پھر کہتی تھیں کہ میری ایک ہی اولاد ہے۔ میں تو دیکھ بھال کے کروں گی۔ اگر لڑکا ٹھیک نہ ہوا تو منگنی توڑ بھی سکوں گی۔ یہ سب باتیں چپکے سے میں سن چکی تھی۔

ادھر تو یہ خیالات، اُدھر بیرسٹر صاحب کے والد صاحب کو بے حد جلدی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر آپ جلدی نہیں کر سکتے تو ہم دوسری جگہ کر لیں گے۔ جہاں سب معاملات طے ہو چکے ہیں مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ابّا جان نے اس کا کیا جواب دیا اور میں تاک میں لگی ہوئی تھی۔ کوئی میرے دل سے پوچھے کہ میرا کیا حال ہوا۔ جب ایک روز چپکے سے میں نے ابّا جان اور امّاں جان کا تصفیہ سُن لیا۔ یہ طے ہو کر لکھا جا چکا تھا کہ اگر آپ کو ایسی ہی جلدی ہے کہ آپ دوسری شادی کیے لیتے ہیں تو بسم اللہ ہم کو ہماری لڑکی بھاری نہیں ہے۔ یہ خط لکھ دیا گیا۔ اور پھر ان سخت مجسٹریٹ کی باتیں ہوئیں کہ میں وہاں جھونکی جاؤں گی۔ نہ معلوم یہ آنریری مجسٹریٹ مجھ کو کیوں سخت ناپسند تھے۔ کچھ ان کی عمر بھی ایسی نہ تھی۔ مگر شاہدہ نے کچھ اُن کا حلیہ یعنی داڑھی وغیرہ کچھ ایسا بنا بنا کر بیان کیا کہ میرے دل میں اُن کے لیے ذرہ بھر جگہ نہ تھی۔ میں گھنٹوں اپنے کمرے میں پڑی سوچتی رہی۔

اس بات کو ہفتہ بھر بھی نہ گذرا تھا کہ میں نے ایک روز اسی طرح چپکے سے الماری کھول کر بیرسٹر صاحب کے والد کا ایک تازہ خط پڑھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے یہ خط شاید ابّا جان کے آخری خط کے ملنے سے پہلے لکھا تھا کہ بیرسٹر صاحب کو خود کسی دوسری جگہ جاتا ہے اور راستہ میں وہ یہاں ہوتے ہوئے جائیں گے۔ اور اگر آپ کو شرائط منظور ہوئیں تو نسبت بھی قرار دے دی جائے گی۔ اُسی روز اس خط کا جواب بھی میں نے سُن لیا۔ انھوں نے لکھ دیا تھا کہ لڑکے کو تو میں خود بھی دیکھنا چاہتا تھا۔

خانہ بے تکلّف ہے۔ جب جی چاہے بھیج دیجیے مگر اس کا خیال دل سے نکال دیجیے کہ سال بھر سے پہلے شادی کر دی جائے۔ امّا جان نے بھی اس جواب کو پسند کیا اور پھر انھیں آنریری مجسٹریٹ صاحب کے تذکرہ سے میرے کانوں کی تواضع کی گئی۔

ان سب باتوں سے میرا ایسا جی گھبرایا کہ امّاں جان سے میں نے شاہدہ کے گھر جانے کی اجازت لی اور یہ سوچ کر گئی کہ تین چار روز نہ آؤں گی۔

شاہدہ کے ہاں جو پہنچی تو اُس نے دیکھتے ہی معلوم کر لیا کہ کچھ معاملہ دگرگوں ہے، کہنے لگی کہ "کیا تیرے بیرسٹر نے کسی اور کو گھر میں ڈال لیا؟"

میں اس کا بھلا کیا جواب دیتی۔ تمام قصہ شروع سے آخر تک سنا دیا کہ کس طرح وہ جلدی کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد شادی ہو جائے۔ مگر امّا جان راضی نہیں ہوتیں۔ یہ سب سُن کر اور مجھ کو رنجیدہ دیکھ کر وہ شریر بولی۔

"خوب! چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ بھلا ایسا کون کرے گا۔ مگر ایک بات ہے۔"

میں نے کہا "وہ کیا۔؟"

وہ بولی "وہ تیرے لیے پھڑک رہا ہے۔ اور یہ فال اچھی ہے۔"

میں نے جل کر کہا "تو فال نکال رہی ہے۔ اور مذاق کر رہی ہے۔"

"پھر کیا کروں؟" شاہدہ نے کہا۔ (کیونکہ واقعی وہ بیچاری کر ہی کیا سکتی تھی۔)

میں نے کہا۔" کوئی مشورہ دو۔ صلاح دو۔ دونوں مل کر سوچیں۔"

" پاگل نہیں تو" شاہدہ نے میری بیوقوفی پر کہا۔" دیوانی ہوئی ہے میں صلاح کیا دوں۔؟ اچھا مجھے پتہ بتا دے۔ میں بیرسٹر صاحب کو لکھ بھیجوں کہ اُدھر تو اس چھوکری پر اُتار دھو رہا ہے۔ اور اِدھر یہ تیرے پیچھے دیوانی ہو رہی ہے۔ آکے تجھے بھگا لے جائے۔"

" خدا کی مار تیرے اوپر اور تیری صلاح کے اوپر" میں نے کہا" کیا میں اسی لیے آئی تھی۔؟ میں جاتی ہوں" یہ کہہ کر میں اٹھنے لگی۔

" تیرے بیرسٹر کی ایسی تیسی" شاہدہ نے ہاتھ پکڑ کر کہا" جاتی کہاں ہے؟ شادی نہ بیاہ میاں کا رونا روتی پھرتی ہے۔ تجھے کیا۔؟ کوئی نہ کوئی ماں کا جایا آکر تجھے لے ہی جائے گا۔ چل دوسری باتیں کر۔"

یہ کہہ کر شاہدہ نے مجھے بٹھا لیا اور میں بھی ہنسنے لگی۔ دوسری باتیں ہونے لگیں۔ مگر یہاں میرے دل کو لگی ہوئی تھی اور پریشان تھی۔ گھوم پھر کر پھر وہی باتیں ہونے لگیں۔ شاہدہ نے جو کچھ بھی ہمدردی ممکن تھی وہ کی اور دُعا مانگی اور پھر آنریری مجسٹریٹ کو خوب کوسا۔ اس کے علاوہ وہ بیچاری کر ہی کیا سکتی تھی۔ خود نماز کے بعد دُعا مانگنے کا وعدہ کیا۔ اور مجھ سے بھی کہا کہ نماز کے بعد روزآنہ دُعا مانگا کر۔ اس سے زیادہ نہ وہ کچھ کر سکتی تھی اور نہ میں۔

میں گھر سے کچھ ایسی بیزار تھی کہ دو مرتبہ آدمی لینے آیا اور نہ گئی۔ چوتھے روز

میں نے شاہدہ سے کہا کہ "اب شاید خط کا جواب آ گیا ہوگا اور میں کھانا کھا کے ایسے وقت جاؤں گی کہ سب سوتے ہوں تاکہ بغیر انتظار کیے ہوئے مجھے خط دیکھنے کا موقع مل جائے۔"

چلتے وقت میں ایسے جا رہی تھی جیسے کوئی شخص اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے جا رہا ہو۔ میری حالت عجیب امید و بیم کی تھی۔ نہ معلوم اس خط میں بیرسٹر صاحب کے والد نے انکار کیا ہوگا۔ یا منظور کر لیا ہوگا کہ ہم سال بھر بعد شادی پر رضامند ہیں۔ یہ میں بار بار سوچ رہی تھی۔ چلتے وقت میں نے اپنی پیاری سہیلی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر زور سے دبایا۔ نہ معلوم کیوں میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ شاہدہ نے مذاق کو رخصت کرتے ہوئے کہا: "بہن خدا تجھے اس موذی سے بچائے۔ تو دعا مانگ اچھا۔" میں نے چپکے سے کہا: "اچھا۔"

(3)

شاہدہ کے یہاں سے جو آئی تو حسب توقع گھر میں سناٹا تھا۔ اماں جان سو رہی تھیں۔ اور ابا جان کچہری جا چکے تھے۔ میں نے چپکے سے جھانک کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نہ تھا۔ آہستہ سے دروازہ بند کیا اور دوڑ کر مردانہ زینہ کا دروازہ بھی بند کر دیا۔ اور سیدھی کمرہ میں پہنچی تو ششدر رہ گئی۔

کیا دیکھتی ہوں کہ ایک بڑا سا چمڑے کا ٹرنک کھلا پڑا ہے اور پاس کی کرسی پر اور ٹرنک میں کپڑوں کے اوپر مختلف چیزوں کی ایک دوکان سی لگی ہوئی ہے میں نے

دل میں کہا کہ آخر یہ کون ہے جو اس طرح سامان چھوڑ کر ڈال گیا ہے۔ کیا بتاؤں میرے سامنے کیسی دوکان لگی ہوئی تھی۔ اور کیا کیا چیزیں رکھی تھیں کہ میں سب بھول گئی۔ انھیں دیکھنے لگی۔ طرح طرح کی ڈبیاں اور ولایتی بکس تھے جو میں نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ میں نے سب سے پیشتر جھٹ سے ایک سنہرا گول ڈبہ اٹھا لیا میں اس کو تعریف کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ گِنّی کے سونے کا ڈبہ تھا اور اس پر سچّی سیپ کا نفیس کام ہو رہا تھا۔ اودی اودی سیپ کے ٹکڑے ہفت رنگ میں جگمگا رہے تھے۔ اور تمام جوڑوں پر ولایتی کندن کا کام ہو رہا تھا۔ ڈھکنا تو بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں موتی جڑے تھے اور کئی قطاریں ننھے ننھے سمندری گھونگھوں کی اس خوبصورتی سے سونے میں جڑی ہوئی تھیں کہ میں دنگ رہ گئی۔ میں نے اُسے کھول کر دیکھا تو ایک چھوٹا سا پاؤڈر لگانے کا پف رکھا تھا۔ اور اس کے اندر سُرخ رنگ کا پاؤڈر رکھا ہوا تھا۔ میں نے پف نکال کر اس کے نرم نرم روئیں دیکھے۔ جن پر غبار کی طرح پاؤڈر کے مہین ذرّے گویا ناچ رہے تھے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ کتنا نرم ہے، میں نے اس کو اپنے گال پر آہستہ آہستہ پھرایا۔ اور پھر اس کو واپس اسی طرح رکھ دیا۔ مجھے خیال بھی نہ آیا کہ میرے گال پر سُرخ پاؤڈر جم گیا۔ میں نے ڈبّہ کو رکھا ہی تھا کہ میری نظر ایک تھیلی پر پڑی یہ سبز مخمل کی تھیلی تھی جس پر سنہری کام میں مختلف تصویریں بنی ہوئی تھیں میں نے اس کو اٹھایا تو میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ دراصل یہ ولایتی ورڈ کی

تھیلی تھی۔ جو مخمل سے بھی زیادہ خوبصورت اور نرم تھی۔ میں نے غور سے سنہری کام کو دیکھا۔ کھول کر جو دیکھا۔ تو اندر دو چاندی کے بالوں میں کرنے کے برش تھے اور ایک ان ہی کے جوڑ کا کنگھا تھا۔ میں نے اس کو بھی رکھدیا۔ اور چھوٹی چھوٹی خوبصورت ڈبیوں کو دیکھا۔ کسی میں سیفٹی پن تھا۔ کسی میں خوبصورت سا بروچ تھا اور کسی میں پھول تھا غرض طرح طرح کے بروچ اور بلاؤس پن وغیرہ تھے۔ دو تین ڈبیاں ان میں ایسی تھیں جو عجیب شکل کی تھیں۔ مثلاً ایک بالکل کتاب کی طرح تھی۔ اور ایک کرکٹ کے بلّے کی طرح۔ ان میں بعض ایسی بھی تھیں جو مجھ سے کسی طرح بھی نہ کھلیں، علاوہ اُن کے سگریٹ کیس دیا سلائی کا بکس اور دوسری چیزیں تھیں اور سب ایسی کہ بس ان کو دیکھا ہی کرے۔ میں ان کو دیکھ رہی تھی کہ ایک مخمل کے ڈبہ کا کونہ ٹرنک میں ریشمی رومالوں میں مجھے دبا ہوا نظر آیا۔ میں نے اس کو نکالا۔ کھول کر دیکھا تو اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے ناخن کاٹنے اور گھسنے کے اوزار رکھے ہوئے تھے۔ ان سب میں سیپ کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت دستے جڑے ہوئے تھے اور ڈھکنے میں ایک چھوٹا سا آئینہ لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کو جوں کا توں اُسی جگہ رکھا تو میرے ہاتھ ایک اور مخمل کا ڈبہ لگا۔ اس کو جو میں نے نکال کر کھولا تو اس کے اندر سے سبز رنگ کا ایک فاؤنٹین پن نکلا۔ جس پر سونے کی جالی کا خول چڑھا ہوا تھا۔ میں نے اس کو بھی رکھدیا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کہ ایک چھوٹی سی سنہری رنگ کی ڈبیہ نظر پڑی۔ اس کو میں نے کھولنا چاہا مگر وہ کمبخت نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ میں اس کو کھول ہی

رہی تھی کہ ایک لکڑی کے بکس کا کونہ نظر پڑا۔ میں نے اس کو فوراً ٹرنک سے نکال کر دیکھا۔ یہ ایک بھاری سا خوب صورت بکس تھا۔ اس کو جو میں نے کھولا تو دنگ رہ گئی۔ اس کے اندر سے ایک صاف شفاف بلّور کا عطردان نکلا جو کوئی بالشت بھر لمبا اور اسی مناسبت سے چوڑا تھا۔ میں نے اس کو نکال کر غور سے دیکھا اور لکڑی کا بکس جس میں یہ بند تھا، الگ رکھ دیا، عجیب چیز تھی۔ اس کے اندر کی تمام چیزیں باہر سے نظر آ رہی تھیں۔ اس کے اندر چوبیس چھوٹی چھوٹی عطر کی قلمیں رکھی ہوئی تھیں۔ جن کے خوشنما رنگ روشنی میں بلّور میں سے گذر کر عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ میں اس کو چاروں طرف سے دیکھتی رہی اور پھر کھولنا چاہا۔ جہاں جہاں بھی جوڑ یا بٹن نظر آئے میں نے دبائے۔ مگر یہ نہ کھلا۔ میں اس کو دیکھ رہی تھی کہ میری نظر کسی تصویر کے کونے پر پڑی۔ جو ٹرنک میں ذرا نیچے کو رکھی تھی۔ میں اس کو بھول سا گئی۔ اور میں نے تصویر کو کھینچ کر نکالا کہ اس کے ساتھ ساتھ ایک مخمل کی ڈبیہ رومالوں اور ٹائیوں میں لڑھکتی ہوئی چلی آئی اور کھل گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ اس میں ایک خوبصورت انگوٹھی جگمگ جگمگ کر رہی ہے۔ فوراً تصویر کو چھوڑ کر میں نے اس ڈبیہ کو اٹھایا اور انگوٹھی کو نکال کر دیکھا۔ بیچ میں اس کے ایک نیلگوں نگ تھا اور اردگرد سفید ہیرے جڑے تھے جن پر نگاہ نہ جمتی تھی۔ میں نے اس خوبصورت انگوٹھی کو غور سے دیکھا اور اپنی انگلی میں ڈالنا شروع کیا۔ کسی میں تنگ تھی تو کسی میں

ڈھیلی۔ مگر سیدھے ہاتھ کی چھنگلی کے پاس والی انگلی میں میں نے اس کو زور دے کر کسی نہ کسی طرح بدقت تمام پہن تو لیا اور پھر ہاتھ اونچا کر کے اس کے نگینوں کی دمک کو دیکھنے لگی۔ میں اسے دیکھ بھال کے ڈبیہ میں رکھنے کے لیے اتارنے لگی تو معلوم ہوا کہ پھنس گئی ہے۔ میرے بائیں ہاتھ میں وہ بلور کا عطردان بدستور موجود تھا اور میں اس کو رکھنے ہی کو ہوئی تاکہ انگلی میں پھنسی ہوئی انگوٹھی کو اتاروں کہ ایکا ایکی میری نظر اس تصویر پر پڑی جو سامنے رکھی تھی۔ اور جس کو میں سب سے پیشتر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس پر ہوا سا باریک کاغذ تھا۔ جس کی سفیدی میں سے تصویر کے رنگ جھلک رہے تھے۔ میں عطردان تو رکھنا بھول گئی اور فوراً ہی سیدھے ہاتھ سے تصویر کو اٹھا لیا اور کاغذ ہٹا کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ سب سامان بیرسٹر صاحب کا ہے!۔ یہ انھیں کی تصویر تھی یہ کسی ولایتی دوکان کی بنی ہوئی تھی۔ اور رنگین تھی۔ میں بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اور دل میں کہہ رہی تھی کہ اگر یہ صحیح ہے تو واقعی بیرسٹر صاحب غیر معمولی طور پر خوبصورت آدمی ہیں۔ چہرہ کا رنگ ہلکا گلابی تھا۔ سیاہ بال تھے۔ اور آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ چہرہ، آنکھ، ناک، غرض ہر چیز اس صفائی سے اپنے رنگ میں موجود تھی کہ میں سوچ رہی تھی کہ میں زیادہ خوبصورت ہوں یا یہ۔ گوٹ دھاریاں ہوشیار مصوّر نے اپنے اپنے اصلی رنگ میں اس خوبی سے دکھائی تھیں کہ ہر ایک ڈورا اپنے رنگ میں صاف نظر آ رہا تھا۔

میں اس تصویر کو دیکھنے میں بالکل محو تھی کہ دیکھتے دیکھتے ہوا کی رمق سے وہ کمبخت باریک سا کاغذ دیکھنے میں مخل ہونے لگا۔ میں نے تصویر کو جھٹک کر الگ کیا۔ کیوں کہ بایاں ہاتھ گھرا ہوا تھا۔ اس میں وہی بلّور کا عطردان تھا۔ پھر اُسی طرح کاغذ اڑ کر آیا اور تصویر کو ڈھک دیا۔ میں نے جھٹک کر الگ کرنا چاہا۔ مگر وہ چپک سا گیا اور علیحدہ نہ ہوا تو میں نے منہ سے پھونکا۔ اور جب بھی وہ نہ ہٹا تو میں نے "اونہہ" کر کے بائیں ہاتھ کی انگلی سے جو اس کاغذ کو ہٹایا تو وہ بلّور کا عطردان بھاری تو تھا ہی ہاتھ سے پھسل کر چھوٹ پڑا۔ اور چھن سے پختہ فرش پر گر کر کھیل کھیل ہو گیا!!۔

میں دھک سے ہو گئی۔ اور چہرہ فق ہو گیا۔ تصویر ایک طرف پھینک کے ایک دم سے شکستہ عطردان کے ٹکڑے اٹھا کر ملانے لگی۔ کہ ایک نرم آواز بالکل قریب سے آئی، "تکلیف نہ کیجیے آپ ہی کا تھا۔" آنکھ اُٹھا کر جو دیکھا تو جیتی جاگتی اصلی تصویر بیرسٹر صاحب کی سامنے کھڑی تھی! تعجب!! اس تعجب نے مجھے سکتہ میں ڈال دیا کہ الٰہی یہ کدھر سے آ گئے۔ دو تین سکنڈ تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں کہ ایک دم سے میں نے ٹوٹے ہوئے عطردان کے ٹکڑے پھینک دیے اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر جھٹ سے دروازہ کی آڑ میں ہو گئی۔

(4)

میری حالت بھی اس وقت عجیب قابلِ رحم تھی۔ بلّیوں دل اچھل رہا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا جو میں کسی نامحرم اور غیر شخص کے ساتھ اس طرح ایک تنہائی کے مقام پر

تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ عین چوری کرتے پکڑ گئی۔ سارا ٹرنک کرید کرید کر پھینک دیا تھا۔ اور پھر عطردان توڑ ڈالا تھا۔ اور نہایت ہی بے تکلفی سے انگوٹھی پہن رکھی تھی۔

اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے تھی۔ سارے بدن میں ایک سنسنی اور رعشہ سا تھا کہ ذرا ہوش بجا ہوئے تو فوراً انگوٹھی کا خیال آیا۔ جلدی جلدی اس کو اتارنے لگی۔ طرح طرح سے گھمایا۔ طرح طرح سے انگلی کو دبایا اور انگوٹھی کو کھینچا۔ مگر جلدی میں وہ اور بھی نہ اتری۔ جتنی دیر لگ رہی تھی۔ اتنا ہی میں اور گھبرا رہی تھی۔ پل پل بھاری تھا۔ اور میں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہر طرح انگوٹھی اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ نہ اُترتی تھی۔ غصہ میں میں نے انگلی مروڑ ڈالی۔ مگر کیا ہوتا تھا۔ غرض میں بے طرح انگوٹھی اتارنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اتنے میں بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "شکر ہے کہ انگوٹھی آپ کو پسند تو آ گئی۔"

یہ سن کر میرے تن بدن میں پسینہ آ گیا اور میں گویا کٹ مری۔ میں نے دل میں کہا کہ میں منہ چھپا کر جو بھاگی تو شاید انگوٹھی انھوں نے دیکھ لی۔ اور واقعہ بھی دراصل یہی تھا۔ اس جملہ نے میرے اوپر گویا ستم ڈھایا۔ میں نے سن کر اور بھی جلدی جلدی اس کو انگلی سے اتارنے کی کوشش کی مگر وہ انگوٹھی کمبخت ایسی پھنسی تھی کہ اترنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ میرا دل انجن کی طرح چل رہا تھا اور

میں کٹی جارہی تھی اور حیران تھی کہ کیونکر اس نامراد انگوٹھی کو اتاروں۔

اتنے میں بیرسٹر صاحب آڑ سے ہی بولے۔" اس میں سے اگر اور کوئی چیز پسند ہو تو وہ بھی لے لیجیے۔" میں نے یہ سن کر اپنی انگلی مروڑ ہی توڑ ڈالی کہ یہ لے تیری یہ سزا ہے۔ مگر بھلا اس سے کیا ہوتا تھا۔ غرض میں حیران اور زچ ہونے کے علاوہ مارے شرم کے پانی پانی ہوئی جاتی تھی۔

اتنے میں بیرسٹر صاحب پھر بولے" چونکہ یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ مجھے اپنی منسوبہ بیوی سے باتیں کرنے کا بلکہ ملاقات کرنے کا موقعہ مل گیا ہے۔ لہٰذا میں اس زرّیں موقعہ کو کسی طرح ہاتھ سے نہیں کھو سکتا"

یہ کہہ کر وہ دروازہ سے نکل کر سامنے آ کھڑے ہوئے اور میں گویا گھر گئی میں شرم و حیا سے پانی پانی ہو گئی۔ اور میں نے سر جھکا کر اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر کونہ میں موڑ لیا۔ اور کواڑ میں گھسی جاتی تھی۔ میری یہ حالت زار دیکھ کر شاید بیرسٹر صاحب خود شرما گئے۔ اور انھوں نے کہا" میں گستاخی کی معافی چاہتا ہوں مگر......" یہ کہہ کر سامنے مسہری سے چادر کھینچ کر میرے اوپر ڈال دی اور خود کمرے سے باہر جا کر کہا۔" آپ مہربانی فرما کر مسہری پر بیٹھ جائیے اور اطمینان رکھیے کہ میں اندر نہ آؤں گا۔ بشرطیکہ آپ میری چند باتوں کا جواب دے دیں"

میں نے اس کو غنیمت جانا اور مسہری پر چادر میں لپٹ کر بیٹھ گئی۔ بیرسٹر صاحب نے کہا" آپ میری گستاخی سے خفا تو نہیں ہوئیں؟"

میں بدستور خاموش انگوٹھی اتارنے کی کوشش میں لگی رہی اور کچھ نہ بولی ۔ بلکہ اور تیزی سے کوشش کرنے لگی۔ تاکہ انگوٹھی اتر آئے۔

اتنے میں بیرسٹر صاحب بولے "۔ بولیے صاحب جلدی بولیے" میں پھر خاموش رہی تو انھوں نے کہا۔" آپ جواب نہیں دیتیں تو پھر میں حاضر ہوتا ہوں"

میں گھبرا گئی اور مجبوراً میں نے دبی آواز سے کہا۔" جی نہیں" میں برابر انگوٹھی اتارنے کی کوشش میں مشغول تھی۔

بیرسٹر صاحب نے کہا۔" شکریہ۔ انگوٹھی آپ کو پسند ہے۔

یا اللہ۔ میں نے تنگ ہو کر کہا مجھے موت دے۔ یہ سن کر میں دراصل دیوانہ وار انگلی کو نوچنے لگی۔ کیا کہوں میرا کیا حال تھا۔ میرا بس نہ تھا کہ انگلی کو کاٹ کر پھینک دوں ۔ میں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا کہ اتنے میں بیرسٹر صاحب نے پھر تقاضا کیا۔ میں اپنے آپ کو کوس رہی تھی ۔ اور دل میں کہہ رہی تھی کہ بھلا اس کا کیا جواب دوں ۔ اگر کہتی ہوں کہ پسند ہے تو شرم آتی ہے۔ اور اگر ناپسند کہتی ہوں تو بھلا کس منہ سے کہوں کیونکہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ یہ نہ کہہ دیں کہ ناپسند ہے تو پھر پہنی کیوں ۔؟ میں چپ رہی اور پھر کچھ نہ بولی۔

اتنے میں پھر بیرسٹر صاحب نے کہا۔" شکر ہے کہ عطروان تو آپ کو ایسا پسند آیا کہ آپ نے اس کو برت کر ختم بھی کر دیا اور گویا میری محنت وصول ہو گئی۔ مگر انگوٹھی کے بارہ میں آپ اپنی زبان سے اور کچھ کہہ دیں۔ تاکہ میں سمجھوں کہ

اس کے دام بھی وصول ہو گئے۔"

میں یہ سُن کر اب مارے غصہ اور شرم کے رونے کے قریب ہو گئی تھی۔ اور تمام غصہ انگلی پر اُتار رہی تھی۔ گویا اس نے عطردان توڑا تھا میں عطردان توڑنے پر سخت شرمندہ تھی۔ اور میری زبان سے کچھ بھی نہ نکلتا تھا۔

جب میں کچھ نہ بولی تو بیرسٹر صاحب نے کہا "آپ جواب نہیں دیتیں لہٰذا میں حاضر ہوتا ہوں۔"

میں گھبرا گئی کہ کہیں آ نہ جائیں اور میں نے جلدی سے کہا "بھلا اس بات کا میں کیا جواب دوں۔ میں سخت شرمندہ ہوں کہ آپ کا عطردان۔۔۔"

بات کاٹ کر بیرسٹر صاحب نے کہا "خوب! وہ عطردان تو آپ ہی کا تھا۔ آپ نے توڑ ڈالا خوب کیا۔ میرا خیال ہے کہ انگوٹھی بھی آپ کو پسند ہے جو خوش قسمتی سے آپ کی انگلی میں بالکل ٹھیک آئی ہے اور آپ اس کو اب تک ازراہ عنایت پہنے ہوئی ہیں۔"

میں اب کیا بتاؤں کہ یہ سُن کر میرا کیا حال ہوا۔ میں نے دل میں کہا خوب انگوٹھی ٹھیک آئی اور خوب پہنے ہوئے ہوں۔ انگوٹھی ہے کہ گلے کی پھانسی ہو گئی۔ جو ایسی ٹھیک آئی کہ اُترنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ میں نے دل میں یہ بھی سوچا کہ اگر یہ کمبخت میری انگلی میں نہ پھنس گئی ہوتی تو کاہے کو میں بے حیا بنتی اور انہیں یہ کہنے کا موقع ملتا کہ آپ پہنے ہوئے ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس نامراد انگوٹھی

کو اتارنے کے لیے کیا کیا جتن کر چکی تھی، اور برابر کر رہی تھی۔ مگر وہ تو ایسی پھنسی تھی کہ اترنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ میں پھر خاموش رہی اور کچھ نہ بولی: مگر انگوٹھی اتارنے کی برابر کوشش کر رہی تھی۔

بیرسٹر صاحب نے میری خاموشی پر کہا: "آپ پھر جواب سے پہلوتہی کر رہی ہیں۔ پسند ہے یا ناپسند۔ ان دو جملوں میں سے ایک کہہ دیجیے۔ ورنہ واضح ہو کہ میں آپ کے پاس حاضر ہونے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہوں۔"

میں نے پھر غصہ میں انگلی کو نوچ ڈالا اور قصہ کو ختم کرنے کے لیے ایک اور ہی لفظ کہہ دیا۔ یعنی "اچھی ہے۔"

"جی نہیں۔" بیرسٹر صاحب نے کہا "اچھی ہے اور آپ کو پسند نہیں تو کس کام کی۔ علاوہ اس کے اچھی تو خود دوکاندار نے کہہ دی تھی اور یہ میں پوچھتا بھی نہیں۔ آپ تو یہ بتائیے کہ آپ کو پسند ہے یا ناپسند۔ ورنہ پھر حاضر ہونے کی اجازت دیجیے۔"

میں نے دل میں کہا۔ کہ یہ قطعی گھس آئیں گے اور پھر جھک مار کر کہنا ہی پڑے گا لہٰذا کہہ دیا "پسند ہے۔" یہ کہہ کر میں دانت پیس کر پھر انگلی نوچنے لگی۔

"شکریہ۔" بیرسٹر صاحب نے کہا "صد شکریہ۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔ لیکن ایک عرض ہے اور وہ یہ کہ یہ انگوٹھی تو بیشک آپ کی ہے اور شاید آپ اس کو پہن کر اتارنا بھی نہیں چاہتی ہیں۔ لیکن مجھ کو مجبوراً آپ سے درخواست

کرنا پڑ رہی ہے کہ شام کو مجھ کو چونکہ اور چیزوں کے ساتھ اس کو بھی رسنا بھجوانا ہے۔ لہٰذا اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو اس وقت اس کو یہاں چھوڑتی جائیں۔ میں علیحدہ ہوا جاتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر وہ ہٹ گئے۔ اور میں نے اُن کے جانے کی آواز سنی۔ وہ سامنے کے غسل خانہ میں چلے گئے۔ دراصل وہ اسی غسل خانے میں کنگھا وغیرہ کر رہے ہوں گے جب میں بے خبری میں آ کر پھنس گئی۔

اب میں سخت چکر میں تھی اور انگلی سے انگوٹھی اتارنے کی سر توڑ کوشش کی گھبراہٹ اور جلدی میں میں پاگل سی ہو رہی تھی۔ کیونکہ بغیر انگوٹھی اتارے میں کسی طرح بھی واپس گھر میں نہ جا سکتی تھی۔ پریشان ہو کر میں نے علاوہ ہاتھ کے دانتوں سے بھی امداد لی اور انگلی میں کاٹ کاٹ کھایا۔ مگر وہ کمبخت انگوٹھی جان لیوا تھی اور نہ اترنا تھی نہ اُتری۔ میں نے تنگ آ کر اپنا سر پیٹ لیا اور رو کر کہا۔ "ہائے اللہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی۔ یہ کمبخت تو میری جان لیے لیتی ہے۔"

بیرسٹر صاحب غسل خانہ میں کھڑے کھڑے تھک گئے اور میں وہیں کی وہیں تھی۔ وہ لوٹ آئے اور بولے "معاف کیجیے نہیں معلوم تھا کہ انگوٹھی اتارنے پر آپ قطعی رضامند نہیں اور اس شرط پر جانا بھی نہیں چاہتیں۔ مگر چونکہ اس رسم کا نام ہی انگوٹھی کی رسم ہے۔ لہٰذا میں اس کی خالی ڈبیہ رکھ دوں گا۔ اور کہلا دوں گا کہ انگوٹھی آپ کے پاس ہے" یہ کہہ کر ذرا رک کر بولے۔" اور تو کسی بات کا خیال

نہیں ہے۔ صرف اتنا کہ آپ کے والد صاحب اس کو بدقسمتی سے دیکھ چکے ہیں"

میں اپنی اُنگلی توڑ رہی تھی کہ اور یہ سُن کر گھبرا گئی۔ یہ تو خیر مذاق تھا۔ کہ وہ کہہ دیں گے کہ انگوٹھی میرے پاس ہے۔ مگر میں سوچ رہی تھی کہ جب آپا جان انگوٹھی دیکھ چکے ہیں تو آخر بیرسٹر صاحب ان سے اس کے بارے میں کیا کہیں گے۔

اتنے میں بیرسٹر صاحب کو شاید شبہ گذرا کہ میں اس وجہ سے نہیں جا رہی ہوں کہ کہیں وہ غسل خانہ میں سے مجھ کو جاتے ہوئے نہ دیکھ لیں۔ لہٰذا وہ ایک دم سے بولے "اوہو! اب میں سمجھا۔ لیجیے بجائے غسل خانہ کے زینہ میں کھڑا ہوا جاتا ہوں"

میں بے حد پریشان تھی۔ اور مجبور تھی کہ اس غلط فہمی کو جلد از جلد دور کردوں، اور اصل وجہ بتا دوں۔ میری عقل کام نہ کرتی تھی کہ الٰہی کیا کروں۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ وہ میرا حال تھا اور وہاں بیرسٹر صاحب نہ جانے کیا خیال کر رہے تھے۔ بالآخر جب میں نے دیکھا کہ اب یہ زینہ میں روپوش ہونے جا رہے ہیں تو مرتا کیا نہ کرتا۔ تنگ آکر نہ معلوم میں نے کس طرح دبی زبان سے کہا۔ "وہ نہیں اُترتی"

اِدھر تو میرا یہ حال تھا اور اُدھر بیرسٹر صاحب گویا مارے خوشی کے اچھل پڑے اور انھوں نے ہنس کر بڑی خوشی کے لہجہ میں جیسے کوئی بے تکلفی سے

کہتا ہے۔ کہا "واللہ! یہ معاملہ ہے!! خدا کرے نہ اُترے۔"

میں بھلا اس جملے کے بعد کیا بولتی۔ اسی طرح چپ تھی۔ اور اپنی بنی کوشش کر رہی تھی کہ انگوٹھی اتر آئے۔ لیکن جب دیر ہوئی تو انھوں نے کہا "اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو میں اتار دوں۔"

یا اللہ! میں نے اپنے دل میں کہا۔ اب میں کیا کروں۔ میں تو نہ اتروا‌ؤں گی۔ یہ طے کر کے میں پھر کوشش کرنے لگی۔ مگر توبہ کیجیے وہ بھلا کیوں اترتی۔ اتنے میں بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "وہ آپ سے ہرگز نہ اُترے گی۔ کوئی ہرج نہیں ہے۔ میں باہر سے اتار دوں گا۔"

میں چونکہ اب تنگ آگئی تھی اور اس مصیبت سے کسی نہ کسی طرح جان چھڑانا چاہتی تھی لہٰذا میں نے مجبوراً ہار کر مسہری پر بیٹھ کر ہاتھ دروازہ کے باہر کر دیا۔

بیرسٹر صاحب نے انگلی ہاتھ میں لے کر کہا "شاباش اس انگوٹھی کو۔! کیوں صاحب تعریف تو آپ بھی کرتی ہوں گی کہ میں کیسی ناپ تول کے ٹھیک ٹھیک انگوٹھی لایا ہوں۔ وہ انگوٹھی ہی بھلا کس کام کی۔ جو یہ تماشہ نہ دکھائے۔"

میں مجبور تھی اور چار و ناچار سن رہی تھی۔ مگر اس جملہ پر مجھ کو اس مصیبت میں بھی ہنسی آگئی کہ دیکھو تو کمبخت کس ناپ کی انگوٹھی آئی کہ مجھے اس مصیبت میں ڈال دیا۔ انگلی کو انھوں نے خوب اِدھر اُدھر سے دیکھ کر اور دبا کر کہا۔ "یہ تو سوج گئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اتارنے کی کوشش کرنے لگے۔

ایک دم سے بولے۔ اخاہ! معاف کیجیے گا۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ اس غریب انگلی پر دانت کس نے تیز کیے ہیں۔

میں نے جھٹ شرمندہ ہو کر ہاتھ اندر کر لیا۔

"لائیے۔ لائیے" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "اب میں کچھ نہ کہوں گا"

مجبوراً پھر ہاتھ بڑھانا پڑا۔ اور انھوں نے انگوٹھی اتارنے کی کوشش کرنا شروع کی۔ انھوں نے خوب خوب کوشش کی۔ خوب دبایا۔ اور وہ بھی کہ درد کے مارے میرا بُرا حال ہو گیا۔ مگر وہ دشمنِ جان انگوٹھی نہ اترنا تھی نہ اُتری۔ لیکن وہ بیچارے ہر ممکن کوشش کر رہے تھے کہ اتنے میں کسی نے مردانہ زینہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بیرسٹر صاحب یہ کہہ کر غسل خانہ کی طرف چلے کہ "آج شام نہ سہی کل شام۔ مگر براہ کرم یہ انگوٹھی جس طرح بھی ممکن ہو میرے پاس ضرور پہنچا دیجیے گا۔" چلتے چلتے وہ ایک ستم کا فقرہ اور کہہ گئے۔ اور وہ یہ کہ "سُرخ پوڈر کی آپ کو چنداں ضرورت تو نہ تھی" میں کٹ ہی تو گئی۔ کیونکہ کمبختی سے ایک گال پر سُرخ پوڈر لگائے ہوئے تھی جو انھوں نے دیکھ لیا تھا۔

ادھر وہ غسل خانے میں بند ہوئے اور اُدھر میں چادر پھینک سیدھی بھاگی اور اپنے کمرہ پر آ کر دم لیا۔ سب سے پہلے آئینہ جو دیکھا تو ایک طرف کے گال پر سُرخ پوڈر رنگ دکھا رہا تھا۔ اپنے کو کوستی گئی اور پونچھتی۔ اس کے بعد میں نے سب سے پہلے انگلی پر ایک پٹی باندھی تاکہ انگوٹھی چھپ جائے اور بہانہ کر دوں کہ چوٹ

لگ گئی ہے۔

(5)

خیر سے یہ بہانہ کارگر ہوگیا۔ اور اماں جان نے چوٹ یا زخم کی وجہ نہیں پوچھی۔ میں نے دردِ سر کا بہانہ کر دیا۔ اور وہ ملازمہ سے یہ کہہ کر چپ ہو رہیں رہنے دے اس کا منگیتر آیا ہوا ہے۔ شرم کی وجہ سے نہیں نکل رہی ہے۔" انھیں یا ملازمہ کو بھلا کیا معلوم تھا کہ یہ کمبخت اس سے ملاقات کر آئی ہے۔ اور صرف ملاقات ہی نہیں بلکہ تمام چیزیں اس کی بگاڑ آئی ہے۔

تیسرے پہر کا وقت تھا۔ اور مجھ کو ہر لمحہ شاہدہ کا انتظار تھا۔ اس کو میں نے بلوایا تو اس نے انکار کر دیا۔ کیونکہ آج ہی تو میں اس کے یہاں سے آئی تھی۔ میں نے پھر اس کو ایک اور خط لکھا تھا کہ "بہن خدا کے واسطے جس طرح بھی بن پڑے جلد آ، ورنہ میری جان کی خیر نہیں۔" اس خط کے جواب میں اس کا انتظار بڑی بے چینی سے کر رہی تھی۔

میں جانتی تھی کہ وہ ضرور آئے گی۔ چنانچہ وہ آئی۔ میں اس کو لینے بھی نہ گئی۔ اماں جان سے اس کو معلوم ہوا کہ بیرسٹر صاحب آئے ہیں۔ اس کی گھبراہٹ رفع ہو گئی اور ہنستی ہوئی آئی اور آتے ہی اس نے نہ سلام نہ دعا، یہ کہا۔ "اری کمبخت باہر جا کے ذرا مل تو آ۔"

"میں تو مل بھی آئی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے یقین نہ آئے تو یہ دیکھ۔"

یہ کہہ کر میں نے انگلی کھول کر دکھائی۔

میں نے شروع سے آخر تک سارا واقعہ تفصیل کے ساتھ سنایا تو شاہدہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور وہ بولی "تونے بڑی مزے دار ملاقات کی؟" یہ کہہ کر وہ چٹکیاں لینے کو بڑھی۔

میں نے کہا "ملاقات تو گئی چولھے میں۔ اب اس ناہنجار انگوٹھی کو کسی طرح اتار۔ چاہے انگلی کٹے یا رہے۔ مگر تو اسے اتار دے اور اسی لیے تجھے بلایا ہے۔"

شاہدہ نے کہا "خیر اُتر تو یہ ابھی آئے گی۔ مگر اسے دینے کیا تو جائے گی۔؟"

اب میں چکرائی کہ یہ کس طرح جائے گی۔ ایسے جانا چاہیے کہ کسی کو معلوم نہ ہوسکے۔ کچھ سوچ کر شاہدہ نے کہا کہ "میں پان میں رکھ کر بھیجدوں گی۔ نوکرانی سے کہلوادوں گی کہ یہ پان اُن کے ہاتھ میں دینا اور کہہ دینا کہ تمہاری سالی نے دیا ہے۔"

یہ تجویز مجھے بھی پسند آئی۔ کیوں کہ اماں جان یہی خیال کرتیں کہ پان میں کچھ مذاق کیا ہوگا۔ جو نئی بات نہ تھی۔

جب اس طرف سے اطمینان ہوگیا تو شاہدہ نے انگوٹھی اتارنے کی کوشش شروع کی۔ بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اس کا اترنا آسان کام نہیں ہے۔ تیل اور صابن کی مالش کی گئی مگر بیکار۔ جب ہر طرح کوشش کرلی تو شاہدہ بھی گھبرائی اور کہنے لگی کہ انگلی سُوج گئی ہے اور یہ خدا ہی ہے جو اُترے۔ غرض گھنٹوں اس میں کوشش اور محنت کی گئی۔ پورا سینے کا بڑا اسُوا لایا گیا۔ چھوٹی بڑی قینچیاں آئیں۔

موچنا لایا گیا۔ کاگ نکالنے کا پیچ اور مشین کا پیچ کش۔ غرض جو اوزار بھی ممکن تھا لایا گیا۔ تھک کر میں بیٹھ گئی اور رو رو کر شاہدہ سے کہتی تھی کہ "خدا کے لیے کوئی صورت نکال" رات کو گرم پانی میں بھی انگلی ڈبوئی گئی۔ اور طرح طرح سے ڈورے ڈال کر کھینچی گئی۔ مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ رہ رہ کر میں پریشان ہوتی تھی۔ اور شاہدہ جب کوشش کر کے تھک جاتی تھی تو یہ کہتی تھی کہ "خدا کے واسطے مجھے اس انگوٹھی کی مصیبت سے نکال"

"آخر تو عشق بازی کرنے گئی ہی کیوں تھی؟" شاہدہ نے خود تنگ ہو کر مجھ سے پوچھا"

"خدا کی مار پڑے تمہاری عشق بازی پر۔ میں تو اس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اور تمھیں یہ مذاق سوجھ رہا ہے" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"یہ عشق بازی نہیں تو اور کیا ہے؟ گئیں وہاں اور شوق سے پاؤڈر اور مسّی لگاتے لگاتے میاں کے چونچلے میں آ کر انگوٹھی پہن لی" شاہدہ نے کہا۔ "اب عشق بازی کے مزے بھی چکھو۔ مزے مزے کی باتیں تو کرنے گئیں، اور اب......"

میں نے اپنے ہاتھ سے اس کا منہ بند کر کے کہا۔ "خدا کے لیے ذرا آہستہ بولو"

"لاؤ قینچی سے انگوٹھی کتر دوں" شاہدہ نے کہا۔ "ویسے یہ نہیں اترے گی"

میں نے کہا۔ "نہ بہن کترا‌ؤں گی نہیں۔ نہ معلوم کتنے قیمت کی انگوٹھی ہوگی۔ ایک تو میں شامت کی ماری عطر دان توڑ آئی۔ اور اب اسے کاٹ ڈالوں"

"بھلا مجال ہے جو وہ چوں بھی کر جائے۔ ابھی کہلوا دوں میاں راستہ دیکھو۔ ہماری چھوکری فاضل نہیں، کہیں اور مانگ کھاؤ۔" یہ کہہ کر شاہدہ نے قینچی لی اور مجھ سے کہا۔ "لاؤ ادھر لاؤ۔"

"نہیں نہیں،" میں نے کہا۔ "ایسا نہ کرو۔" پھر وہی کوششیں جاری ہوگئیں۔ غرض اس انگوٹھی نے رات کا سونا حرام کر دیا۔ رات بھر انگلی طرح طرح سے کھینچی گئی۔ کبھی میں اپنے کو خوب کوستی تھی اور کبھی انگوٹھی کو برا بھلا کہتی تھی۔ اور کبھی گڑگڑا کر دعا مانگتی تھی کہ خدایا میری مشکل آسان کر دے۔

مجبور ہو کر صبح میں نے شاہدہ سے کہا کہ "اب میری انگلی ویسے بھی درد کے مارے پھٹی جا رہی ہے۔ تو کاٹ دے۔"

شاہدہ نے قینچی سے انگوٹھی کاٹنے کی کوشش کی۔ امید تھی کہ سونا ہے آسانی سے کٹ جائے گا۔ مگر وہ گنی کا سخت سونا تھا اور تھوڑی دیر بعد معلوم ہو گیا کہ اس کا کاٹنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ طرح طرح کے اوزار استعمال کیے گئے۔ مگر سب بیکار۔ اب تو میں اور بھی گھبرا گئی اور ایسی حواس باختہ ہوئی کہ شاہدہ سے کہنے لگی کہ مجھے زہر مل جائے تو میں کھا کر اپنا قصہ ختم کر دوں۔

اب شاہدہ بھی متفکر تھی۔ اور اس نے بہت سوچ سمجھ کر مجھ سے نرمی سے کہا کہ "اب صرف ایک ترکیب ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔ "بتاؤ۔"

"وہ یہ ہے"۔ شاہدہ نے مسکرا کر کہا۔ "وہ یہ کہ تم اوپر جاؤ اور اپنے چھپنے سے نکلواؤ۔ ورنہ شام تک ضرور پکڑی جاؤ گی۔ اور ناک چوٹی کٹے گی"۔

"میں تو کبھی نہ جاؤں گی"۔ میں نے کہا۔ "چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے"۔

"یہ باتیں اور وہ بھی پھر ہم سے!"۔ شاہدہ نے کہا۔ "ذرا دل سے تو بوجھ"۔

میں نے واقعہ کہا کہ "خدا کی قسم میں کسی طرح بھی جانا پسند نہیں کرتی۔ میں اس وقت اس بدبخت انگوٹھی کی بدولت جان سے بیزار ہو رہی ہوں"۔

شاہدہ بولی:"میں مذاق نہیں کرتی۔ خواہ پسند کرو یا نہ کرو۔ جانا ضرور پڑے گا کیونکہ گھر کے کسی اوزار سے بھی ناممکن ہے کہ ہم یا تم اسے اتار یا کاٹ سکیں"۔

میں چُپ بیٹھی رہی اور سوچتی رہی۔ شاہدہ نے آہستہ آہستہ سب اونچ نیچ بتائی کہ کوئی نقصان نہیں۔ خاص طور پر جب وہ اس قدر شرمیلے اور باحیا ہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ کوئی چارہ ہی نہ تھا اور مجبوراً میں راضی ہو گئی۔

(6)

جب سناٹا ہو گیا تو اوپر پہنچی۔ شاہدہ بھی ساتھ تھی۔ دروازہ کے پاس پہنچ کر میرا قدم نہ اٹھتا تھا۔ شاہدہ نے مجھے ہٹا کر جھانک کر دیکھا۔ کواڑ کی آواز سُن کر بیرسٹر صاحب نکل آئے، کیونکہ وہ شاید منتظر ہی تھے۔ وہ سیدھے غسل خانے میں بند ہونے چلے۔ وہ جیسے ہی دروازہ کے سامنے آئے، اس شریر شاہدہ کی بچی نے

مجھے ایک دم سے آگے کر کے دروازہ تیزی سے کھول کر اندر کو زور سے دھکیل دیا۔ وہ اتنے قریب تھے کہ میں سیدھے اُن سے لڑ گئی۔ وہ اس نامعقولیت کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ "ارے ؟" کہہ کر انھوں نے مجھے ہاتھوں سے روکا۔ وہ خود بے طرح گھبرا گئے۔ میری حالت پر انھوں نے رحم کھا کر منہ موڑ لیا۔ میں کیا بتاؤں کہ میرا کیا حال ہوا۔ اور دروازہ شاہدہ نے بند کر لیا تھا۔ اور میں سیدھی کمرے میں گھس گئی اور چادر میں کسی طرح اپنے کو لپیٹ کر بیٹھ گئی۔

بیرسٹر صاحب آئے تو سب سے پہلے انھوں نے سلام کر کے زبردستی اندر گھسنے کی دھمکی دے کر جواب لیا۔ اور مزاج پوچھا۔ اس کے جواب میں میں نے ہاتھ دروازہ سے باہر کر دیا۔

"یہ کیا حالت ہے ؟" بیرسٹر صاحب نے انگلی کو دیکھ کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے انگلی اور انگوٹھی دونوں پر آپ نے عملِ جرّاحی کیا ہے۔"

میں کچھ نہ بولی، اور انھوں نے انگلی کو چاروں طرف سے اچھی طرح دیکھا۔ اور پھر پوچھا۔ "براہ مہربانی پہلے یہ بتا دیجیے کہ یہ کون شریر ہیں جنھوں نے آپ کو میرے اوپر دھکیل دیا۔ آپ کے لگی تو نہیں ؟"

میں نے صرف ایک لفظ کہا۔ "شاہدہ"

"آپ کی کوئی ہمجولی معلوم ہوتی ہیں۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "ماشاء اللہ ہیں بڑی سیدھی۔"

میں دل میں شاہدہ کی شرارت پر ہنسنے لگی کہ دیکھو اس کمبخت نے کیسی شرارت کی۔

"میں صابون لاتا ہوں" یہ کہہ کر وہ صابون لینے گئے۔ مجھ سے کہا بھی نہ گیا کہ صابون کی مالش ہو چکی ہے۔ بیرسٹر صاحب نے صابون سے خوب اچھی طرح مالش کی اور پھر طرح طرح سے انگوٹھی اتارنے کی کوشش کی۔ مگر سب بے سود ثابت ہوئی۔ جب ہر طرح وہ کوشش کر چکے تو تھک کر انھوں نے کہا: "یہ انگوٹھی آپ پہنے رہیے۔ بڑی نیک فال ہے، میری قسمت اچھی ہے ورنہ ہزار روپیہ خرچ کرتا جب بھی اس ناپ کی انگوٹھی مجھے نہ ملتی۔"

میں گھبرا گئی اور مجھے شرم آئی۔ بجائے منہ سے بولنے کے میں نے ہاتھ کو جھٹکا کہ گویا اتار دیجیے۔

"اب یہ نہیں اتر سکتی" انھوں نے نہایت ہی لاپرواہی سے کہا۔

"پہنے رہیے۔"

میں سخت گھبرائی اور شرم و حیا سب رخصت کر کے بولی "خدا کے واسطے میرے اوپر رحم کیجیے اور کوئی تدبیر کیجیے۔ خواہ انگلی کٹے یا رہے۔"

بیرسٹر صاحب بولے "اتر تو یہ سکتی ہے مگر آپ منظور نہ کریں گی۔"

میں چپ رہی کہ الٰہی کیوں نہ منظور کروں گی۔ بیرسٹر صاحب بھی چپ رہے۔ مجبور ہو کر میں نے پھر بے حیا بن کر کہا: "مجھے سب منظور ہے۔ اتر جائے۔"

مجھے قطعی نہ معلوم تھا کہ اس سے ان کا کیا مطلب ہے۔ وہ یہ سن کر اندر چلے آئے۔ میں چادر میں منہ چھپا کر بالکل سکڑ گئی۔ وہ پلنگ کے سامنے بالکل میرے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ اور کہنے لگے دراصل اس میں تین ہاتھوں کی ضرورت ہے۔ آپ کو منظور ہو تو میں اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے آہستہ آہستہ صابون لگا کر دباتا ہوں، آپ اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اوپر کرنے کی کوشش کیجیے ورنہ اور کوئی تدبیر نہیں۔

مجبوری سب کچھ کرواتی ہے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے صابون کی مالش کر کے انگلی دبائی اور میں نے انگوٹھی اتارنے کی کوشش کی۔

میرا سارا منہ چادر سے ڈھکا تھا۔ کیونکہ میں سر سے پیر تک چادر میں لپٹی بیٹھی تھی۔ میں ٹٹول ٹٹول کر انگوٹھی اوپر کر رہی تھی۔ دو مرتبہ انگوٹھی چکر کھا کر انگلی کی گرہ پر سے لوٹ گئی۔ بیرسٹر صاحب نے جب تیسری مرتبہ دیکھا کہ میں کہیں کی کہیں انگوٹھی سرکاتی ہوں تو انھوں نے کہا "آپ کو تو انگوٹھی اتروانے کے لیے سب منظور ہے۔ اس کام میں تین ہاتھوں کے علاوہ دراصل چار آنکھوں کی بھی ضرورت ہے۔ اور بدقسمتی سے یہاں صرف دو ہی کام کر رہی ہیں مگر آپ کو تو سب منظور ہے"۔ یہ کہہ کر انھوں نے ایک جھٹکے سے میری چادر اتار لی اور کھینچ کر اس کو الگ پھینک دیا۔ میں سمٹ سی گئی اور میں نے اپنا منہ گود میں چھپا کر چادر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"بخدا میری یہ ہمت نہیں کہ آپ کی طرف آنکھ بھی اٹھا سکوں۔ لہٰذا چادر کی قطعی

آپ کو ضرورت نہیں۔ ویسے میں منع نہیں کرتا۔ مگر اپنا ہاتھ اور دونوں آنکھیں استعمال کیجیے۔"

یہ کہہ کر وہ واقعی بالکل نیچی نظر کر کے پھر اسی طرح کوشش کرنے لگے۔ میں پھر چادر کی طرف بڑھی تو انھوں نے انگلی گھسیٹ کر روکا اور کہا "آپ دوسرا ہاتھ منہ پر رکھے ہیں، کیا میری قسم کا آپ کو اعتبار نہیں۔؟ بخدا میں آپ کو ہرگز نہ دیکھوں گا۔"

یہ انھوں نے اسی طرح کہا جیسے کوئی بُرا مان کر کہتا ہے۔ میں نے مجبوراً ہاتھ ہٹا کر انگلی کو دبانا شروع کیا۔ مگر کیا کہوں میرا کیا حال تھا۔ حالانکہ وہ میری طرف بالکل نہیں دیکھ رہے تھے۔ اور دیدہ و دانستہ ضرورت سے زیادہ گردن جُھکائے تھے۔ مگر پھر بھی میں سمٹی جا رہی تھی، دونوں ہاتھ علیحدہ تھے اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ چہرہ کدھر لے جاؤں۔

لیکن یہ حالت تھوڑی ہی دیر رہی کیونکہ انھوں نے کہا کہ "آپ تو اتارنے میں کچھ دلچسپی ہی نہیں لیتی ہیں۔" میں سب گویا بھول کر کوشش کرنے لگی۔

دونوں کی کوششیں جاری تھیں۔ لیکن میں رہ رہ کر اپنی نظر انگوٹھی پر سے ہٹا کر بیرسٹر صاحب کی کشادہ پیشانی اور صاف و شفاف جُھکے ہوئے چہرہ پر بھی چپکے سے ڈالتی تھی۔ کبھی میں اُن کے پپوٹوں کو دیکھتی اور کبھی کبھی لمبی لمبی پلکوں کو دیکھتی تھی۔ مجھ کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ جب میں ایسا کرتی ہوں تو میرا ہاتھ کام

کرنے سے خود بخود رُک جاتا ہے اور جو شخص غور سے انگلی اور انگوٹھی کی طرف دیکھ رہا ہے وہ آسانی سے بغیر میرے چہرے کو دیکھے ہوئے معلوم کر سکتا ہے کہ میری آنکھیں اب کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہیں چنانچہ ایک مرتبہ میں نے ہمت کر کے بیرسٹر صاحب کے چہرے کو غور سے نظر بھر کر دیکھا، وہاں میرا ہاتھ معطل ہو گیا تو بیرسٹر صاحب نے مجبوراً تنگ آ کر کہا " مجھے آپ بعد میں فرصت سے دیکھ لیجیے گا۔ اس وقت براہِ کرم اِدھر دیکھیے " یہ کہہ کر انھوں نے میری انگلی کو جھٹکا مجھے اس قدر شرمندگی معلوم ہوئی کہ میں نے جھٹ اپنا منہ اپنے بائیں ہاتھ کی کہنی سے چھپا لیا۔

بیرسٹر صاحب نے کہا۔" اچھا معاف کیجیے " اور یہ کہہ کر اُسی طرح نیچی نظر کیے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر کام میں لگا دیا۔

پھر میری ہمّت نہ پڑی کہ بیرسٹر صاحب کی طرف دیکھوں۔ اور بڑے غور سے میں نے اپنی انگوٹھی اتروانے کی کوشش کی۔

خوب خوب ہم دونوں نے کوشش کی۔ مگر وہ دشمنِ جان انگوٹھی نہ اترنا تھی نہ اُتری، جب بیرسٹر صاحب زچ آ گئے اور کوئی امید نہ رہی تو انھوں نے ہاتھ روک لیا۔ اور اسی طرح نظر نیچی کیے ہوئے بولے " یہ نہیں اتر سکتی۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ نے یہ کس مقصد سے پہنی تھی۔؟ "

میں جھینپ گئی اور میں نے بائیں ہاتھ کی کہنی سے اپنا منہ چھپا لیا۔

بیرسٹر صاحب نے کہا۔" بس ایک سوال کا جواب دیجیے، تو ابھی آپ کو خلاصی مل جائے۔ وہ یہ کہ آپ صرف یہ بتا دیں کہ آخر قبل از وقت آپ نے اسے کیوں پہن لیا ؟ '' ہاتھ کو انھوں نے آہستہ سے جھٹک کر کہا۔" بولیے"

میں کچھ نہ بولی تو انھوں نے کہا۔" تو پھر آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میں صرف اسی شرط پر مشکل آسان کر سکتا ہوں۔"

میں نے بڑی کوشش سے زبان ہلائی۔ کہا۔" یونہی۔" میں اپنی آنکھوں کے گوشہ سے کہنی کی آڑ سے بیرسٹر صاحب کے خوبصورت چہرہ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اُن کی لمبی لمبی سیاہ پلکیں بدستور اسی طرح زمین کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔

انھوں نے میرا جواب سُن کر نہایت ہی سادگی سے کہا۔" آپ کے والد صاحب قبلہ تو سال بھر کا وقت مانگتے ہیں۔ مگر شکر ہے کہ آپ خود۔۔۔۔۔۔" انھوں نے شاید میرے اوپر رحم کیا کہ جملہ پُورا نہ کیا۔ گو کہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ ایک دم سے بات بدل کر بولے۔" آپ کے جواب کا شکریہ، اب عرض یہ ہے کہ یہ انگوٹھی کٹ کر اترے گی اور مجھ کو بازار سے جا کر خود ریتی لانا پڑے گی۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور دروازہ کی طرف رُخ کر کے دیکھنے لگے۔

میں نے موقعہ کو غنیمت خیال کر کے چادر قبضہ میں کر کے اپنے اوپر ڈال لی۔ مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ ایک چھوٹی سی ریتی میں نے اس چھوٹے سے بکس میں

دیکھی تھی۔ جس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ناخن کترنے اور گھسنے کے اوزار رکھے تھے۔ میں بولنے ہی کو تھی کہ بیرسٹر صاحب نے کہا۔" میں اس مقام سے واقف نہیں، مگر جاتا ہوں اور کہیں نہ کہیں سے ریتی ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔ آپ مناسب خیال کریں تو اندر چلی جائیں" یہ کہہ کر وہ کھونٹی کی طرف اپنی ٹوپی لینے بڑھے۔

میں نے ہمّت کر کے صرف کہا کہ "ہے"

"کہاں ہے" بیرسٹر صاحب نے مڑ کر پوچھا۔

میں نے جواب میں ٹرنک کی طرف انگلی اٹھا دی۔

"میرے ٹرنک میں؟" بیرسٹر صاحب نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "میرے ٹرنک میں؟"

"جی" میں نے دبی آواز میں کہا۔

"کم از کم ابھی تک تو مجھے ریتی اور پھاؤڑے سوٹ کیس میں رکھنے کی ضرورت پڑی نہیں ہے۔ آئندہ خدا مالک ہے۔ وہ اور بات ہے کہ جب آپ....." اتنا کہہ کر رک گئے۔ لیکن میں سمجھ گئی کہ یہ خواہ مخواہ کی چوٹ مجھ پر کستے ہیں۔ بولے کہ "آپ ہی پھر تکلیف کر کے نکال بھی دیں۔ کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ میرے پاس کوئی ریتی یا پھاؤڑہ نہیں ہے۔"

اٹھنا تو پڑتا ہی۔ یہ سوچ کر کہ اس بھلے آدمی کو ذرا قائل ہی کر دوں میں اٹھی انہوں نے بڑھ کر سوٹ کیس کھول دیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اور چیزیں اُلٹ

پلٹ کر وہ بکس نکال کر اُن کے سامنے ڈال دیا۔

"اوہو! بیشک اس میں ضرور ہو گی۔ معاف کیجیے گا۔ آپ نے خود ہی تو میرے ٹرنک کا جائزہ لیا ہے۔ مگر دیکھ لیجیے پھاوڑہ نہیں ہے"۔

اُن کی آنکھیں واقعی اسی طرح تھیں کہ میں آزادی سے بار بار ان کو دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ بیچارے قسم کھانے کو بھی پلک نہ اُٹھاتے تھے میں دل میں کہہ رہی تھی کہ یہ کتنے اچھے اور شرمیلے شخص ہیں۔

بکس میں سے ایک لمبی سی سیپ کے دستہ کی نازک سی ریتی نکلی۔ اور بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "اگر اب تین ہاتھ اور چار آنکھیں کام میں لگیں تو بس پانچ منٹ کا کام ہے"۔ چونکہ کافی دیر ہو گئی تھی۔ میں نے بہت دیکھ بھال کے اپنی انگلی اچھی طرح پکڑ لی۔ اس طرح کہ انگوٹھی نہ ہٹ سکے اور بیرسٹر صاحب نے اس باریک اور تیز ریتی سے اس ظالم انگوٹھی کو کاٹنا شروع کیا۔ دراصل اس کا ریتنا بھی دُشوار ہو رہا تھا۔ کیونکہ اِدھر اُدھر انگلی کا گوشت اُبھرا ہوا تھا۔ بیرسٹر صاحب انگوٹھی کاٹنے میں مشغول تھے اور کمبختی سے پھر اپنی آنکھ کے گوشے سے اُن کی لمبی لمبی پلکیں اور صاف و شفاف پیشانی دیکھ رہی تھی۔ انگوٹھی کو کاٹتے کاٹتے بیرسٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ نے مجھ کو اچھی طرح دیکھا ہے۔؟"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ تو انھوں نے کہا۔ "تو پھر کام چھوڑے دیتا ہوں

ورنہ جواب دیجیے۔" یہ کہہ کر انھوں نے ہاتھ روک لیا۔

مجھ کو جلدی ہو رہی تھی اور میں سمجھی کہ یہ سوال اسی جواب پر ختم ہو جائے گا لہٰذا میں نے کہہ دیا۔ "جی ہاں" یہ کہہ کر میں شرما گئی۔

بیرسٹر صاحب نے کہا۔ "مگر میں نے اب تک آپ کو نہیں دیکھا ہے۔ سوائے ایک جھلک کے۔ اور وہ بھی محض اتفاقاً"

دراصل یہ واقعہ تھا کہ مجھے انھوں نے ایک مرتبہ بھی نظر بھر کر نہ دیکھا تھا۔ حالانکہ ان کو میں برابر دیکھتی رہی تھی جس سے انکار ہی نہ کر سکتی تھی۔ میں چپ ہو رہی اور کچھ نہ بولی۔ انگوٹھی ذرا سی رہ گئی تھی اور بیرسٹر صاحب نے ہاتھ روک کر اسی طرح نظر نیچی کیے ہوئے کہا۔ "اتنی محنت میں نے مفت کر دی۔ لیکن اب میں بغیر مزدوری یہ قطعی نہیں کر سکتا۔ وعدہ کیجیے۔ کیونکہ یہ تو بے انصافی ہے کہ آپ مجھ کو دیکھ لیں اور میں نہ دیکھوں۔"

میں چپ رہی اور چادر سے منہ کو اچھی طرح چھپانے لگی کہ انھوں نے انگلی بھی چھوڑ دی۔ مجھ کو سخت جلدی ہو رہی تھی اور میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "خدا کے واسطے۔"

"بس۔ بس۔ یہ لیجیے۔" یہ کہہ کر انھوں نے چشم زدن میں انگوٹھی کو کاٹ کر نکال دیا۔ اور میری جان میں جان آئی۔

"میری مزدوری۔" بیرسٹر صاحب نے کہا۔

میں نے اور بھی چادر میں منہ چھپالیا۔

"یہ نہیں ہو سکتا" یہ کہہ کر انھوں نے ایک جھٹکے سے چادر کو منہ سے الگ کر دیا۔ سیدھا ہاتھ میرا پکڑے ہوئے تھے۔ میں نے ہاتھ کی کہنی اپنے منہ پر رکھ لی۔

"یہ کوئی انصاف نہیں ہے" بیرسٹر صاحب بولے "اگر آپ کو کافی فرصت ہے تو بسم اللہ اسی طرح بیٹھی رہیے"

میں سخت گھبرا رہی تھی اور سر زمین کی طرف جھکائے ہوئے کہنی سے منہ چھپائے بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیسے جان چھڑاؤں، سیدھا ہاتھ وہ پکڑے ہی تھے۔ انھوں نے کہا "معاف کیجیے گا" اور یہ کہ کر میرا بایاں ہاتھ جس سے میں منہ چھپائے تھی۔ میرے منہ پر سے ہٹا دیا۔ مجبوراً میں نے اپنا منہ کندھوں اور گریبان اور اپنی گود میں چھپانے کی کوشش کی تو انھوں نے ہاتھ چھوڑ کر اپنے ہاتھ سے میری ٹھوڑی اوپر کی تو میں نے پھر اپنا ہاتھ آزاد پا کر اس سے چہرہ ڈھک لیا۔ زچ ہو کر بیرسٹر صاحب نے کہا "کاش کہ میرے تین ہاتھ ہوتے" قصہ مختصر وہ میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیتے تو میں گود میں منہ چھپالیتی۔ اور ہاتھ چھوڑ کر میرا سر اوپر کرتے تو میں ہاتھ سے چھپالیتی۔

تنگ آکر بیرسٹر صاحب نے کہا "اب دیر ہو رہی ہے۔ خواہ کچھ ہی ہو آپ کو نجات اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک کہ آپ ایمانداری سے میری مزدوری نہ چکا دیں۔ مجبوراً اپنی جان چھڑانے کے لیے میں نے لمحہ بھر کے لیے

آنکھیں بند کرلیں اور ہاتھ چہرے پر نہ لے گئی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو ان کو اپنے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے پایا۔ اور دوسرا ہاتھ بھی جھٹک کر میں نے چھڑا لیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر چادر کو اکٹھا کر کے جانے کے لیے سرکی۔

میں چلنے ہی کو تھی کہ انھوں نے نرم آواز میں کہا "ٹھہریئے" میں نے جھانک کر دیکھا تو وہ سوٹ کیس میں سے کوئی چیز نکال رہے تھے۔ انھوں نے ایک چھوٹا سا ڈبہ نکالا اور اس میں سے ایک سونے کی گھڑی نکال کر میری کلائی پر باندھی۔ اور کہا "بقیہ چیزیں شام کو" اتنا کہہ کر میرا ہاتھ پکڑ کر ذرا جھٹک کر کہا۔ "ہمیں بھولو گی تو نہیں۔؟"

میں کچھ نہ بولی۔ مگر اپنی کہنی اور چادر کی آڑ سے اُن کے خوبصورت چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ کیا کہوں کہ اس جملہ کا میرے دل پر کیسا اثر ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے یہ الفاظ دل سے کہے تھے۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے پھر یہی کہا اور جب میں پھر کچھ نہ بولی تو بائیں ہاتھ سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھا کر کہا۔ "خدا کے واسطے بھولو گی تو نہیں"

میں نے سر ہلا کر بتایا کہ نہیں بھولوں گی۔ وہ جھکے ہوئے تھے اور میری آنکھیں چادر کے کونے سے چار ہوئیں۔ کیونکہ میں کمبخت پھر جھانک رہی تھی۔ میرا یہ سر ہلانا بس غضب ہی تو ہو گیا۔ ایک ہاتھ تو میری ٹھوڑی پر تھا۔ دوسرے ہاتھ سے بے خبری میں انھوں نے جھٹک کر میرا ہاتھ چہرے سے الگ کر دیا۔ "بھولنا مت۔ بھولنا مت

بھولنا مت۔" خدا کی پناہ! میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور سانس رُک گئی۔

جس طرح بھی بن پڑا میں اس مصیبت سے اپنی جان چھڑا کر بھاگی اور تیر کی طرح دروازہ میں گھس گئی۔

" اری یہ کیا؟! یہ کیا؟!" شاہدہ نے مجھے بے ترتیب اور حیران دیکھ کر کہا "یہ کیا؟"

میں نے بن کر کہا "کچھ نہیں، ہوتا کیا"

شاہدہ بولی "خالہ آئی تھیں اور پوچھتی تھیں"

میں سَن سے ہو گئی۔ اور گھبرا کر میں نے کہا "پھر تم نے کیا کہہ دیا"

شاہدہ نے نہایت سادگی سے کہا "کہتی کیا؟ میں نے کہہ دیا کہ شہد کھا رہی ہے ابھی آتی ہے"

" خدا کی مار تیرے اوپر تو نے تو مجھے دہلا دیا۔؟"

وہ بولی "ذرا مجھے تو بتا سہی کہ یہ کیا ہو رہا تھا؟ کمبخت......"

میں نے بات کاٹ کر کہا "ہم نہیں بتاتے" یہ کہہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ گھسیٹا۔ کمرہ میں آئی۔ اور اسے وہ گھڑی دکھانے لگی۔ جو بیرسٹر صاحب نے تحفتاً پہنا دی تھی۔

شاہدہ نے اس میں کوک بھری اور پھر کان سے لگا کر کہنے لگی "اب تو نے بیرسٹر کو پھانس لیا۔ اور وہ سال بھر چھوڑ دو سال انتظار کرے گا۔ مگر کرے گا تجھی سے"

شام کو تمام دوسری چیزیں مثلاً پوڈر کا ڈبہ اور دوسری ڈبیاں وغیرہ وغیرہ معہ انگوٹھی کے آئیں، نہ معلوم کس سے اس قدر تھوڑے وقت میں بیرسٹر صاحب نے انگوٹھی کو اس صفائی سے جڑوایا کہ سوائے شاہدہ کے اس وقت کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ ابّا جان کو بیرسٹر صاحب نے پھسلا کر راضی کرلیا۔ اور سال بھر کے بجائے چھ مہینہ پر آ گئے۔ بیرسٹر صاحب دو مہینہ بعد پھر آئے۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ضرور مجھ سے ملنا چاہتے ہوں گے۔ بلکہ شاید اسی امید پر آئے ہوں گے۔ مگر میں جھانکنے تک نہ گئی۔ کچھ تحفہ وغیرہ بھجوا کر چلے گئے۔

چھ مہینوں میں سے چار مہینے تو گذر گئے ہیں اور دو مہینے باقی ہیں۔ کچھ بھی ہوا اچھا یا برا۔ مگر اس انگوٹھی کی مصیبت کو عمر بھر نہ بھولوں گی۔

Rs. 12/=